

ایلی کے دل میں شہزاد کے لئے نئے جذبات ابھر رہے تھے۔ وہ شہزاد کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے اوپر نیلا جہاں پھر اسے وہ دن یا آگیا جب وہ براتیوں کی حیثیت سے شہزاد کو لارہے تھے۔ جب شہزاد نے ڈبے میں بزرگٹڑی بنی بیٹھی تھی اور محلے کے لڑکے باری باری زنانے ڈبے کی طرف جاتے تھے اور بہانے بہانے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دعا میں مانگتے تھے کہ اس بزرگٹڑی کے پٹ کھل جائیں اور وہ ایک جھلک دیکھیں صرف ایک جھلک — اس روز بھی گاریں سر بزرگ میدانوں میں بھاگ رہی تھی اور دور پہاڑیوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں جب پر نیلا آسمان تناہوا تھا۔

اس سفر کو بیتے ہوئے آج بارہ برس ہو چکے تھے۔ بارہ برس۔ اب شہزاد چار بچوں کیاں تھیں مگر اس کے انداز کی رنگینی میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی جاذب نظر تھا۔ اس کے ماتھے کا تل ویسے ہی روشن تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی خم و پیچ سے بھر پور تھا۔ انکھیں اسی طرح مدھ بھری تھیں۔ ڈلتی تھیں۔ ایلی کو شہزاد کا قرب حاصل ہونے دس سال ہو چکے تھے۔ دس سال سے شہزاد نے اسے انکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور صرف یہی نہیں دس سال سے اس نے اسے اعلانیہ اپنار کھا تھا۔ اب تو بات اتنی پرانی ہو چکی تھی۔ کہ لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور وہ تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن ایلی مسلسل دس سال سے شہزاد سے شادی رہا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ شہزاد اس کے قریب نہیں آتی۔ اس سے دور رہتی ہے۔ اس سے سرف کھینا مقصود ہے جیسے ایلی کھلوٹا ہو۔ ایلی کا خیال تھا کہ شہزاد کو صرف ایلی کے اس جذبے کو قائم کرنے کا شوق ہے جو اس کے دل میں شہزاد کے لئے موجود تھا اس سے بذات خود ایلی سے کوئی

دچپی نہیں۔ ایلی سوچ تھا تھا۔ ہاں۔ واقعی اس نے شہزاد کی محبت کی قدر نہیں کی بلکہ اسے کبھی تسلیم تک نہیں کیا۔ اور وہ ہمیشہ اس بات کا کوشش رہا کہ اس سے جسمانی قرب پیدا کرے۔

پھر سادی کے آنے کے بعد ایلی نے دلنا محسوس کیا تھا کہ شہزاد اس کی محبت میں اس کی زندگی میں رکاوٹ ہے اور اسی وجہ سے اس کی زندگی نارمل نہیں رہی۔ نہیں رہ سکتی۔ سادی سے میل ملاپ کے بعد اس نے شدت سے محسوس کیا تھا ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرنا غذیم بدلتی ہے۔

لیکن ایلی سوچنے لگا ان میں شہزاد کا گیا تصور کہ وہ شادی شدہ تھی۔ شہزاد نے تو اس کا ہاتھ نہیں تھا ماتھا خود ایلی نے اس کا ہاتھ تھا ماتھا اور ہاتھ تھا متھے ہوئے تو اس کو احساس نہ تھا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے اس وقت تو شخص ہوں کی وجہ سے اس نے ہاتھ تھا ماتھا۔ مانا کہ اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ صرف ایک حسین عورت کا قرب۔ اور وہ قرب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف اس لئے دکھی تھا کہ وہ شہزاد کو اعلانیہ اپنانا چاہتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن خواہش تھی اور چونکہ پوری نہ ہو سکتی تھی لہذا اسے آتش رقبہت میں جاننا شروع کر دیا تھا۔ وہ شہزاد کے نقاب ابھرے ہوئے تاروں کو گنا کرتا تھا۔

ایلی کو ان باتوں پر ازسر نہ دامت ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے شہزاد کی قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کی قدر نہیں کی۔ اس کی قربانی اور جرات کی قدر نہیں کی۔

”نہیں نہیں۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میرا کام ہے اسے منانا۔ اس کے آگے سیس نوانا۔“

ہاں ہاں۔ اب میں اس کے پاس پہنچ لوں اب کی بار
محلے کا میدان ویران پڑا تھا۔ غالباً محلے کے لٹکے دوسری طرف کھیل رہے تھے

عورتیں غالباً گرمی کی وجہ سے اپنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جا چکھی تھیں۔ اس وقت غالباً ۹ بجے ہوں گے لیکن گرمیوں میں رات کے ۹ بجے تک تو میدان میں چہل پہلی رہا کرتی تھی۔

ایلی نے اوپر کھڑکیوں کی طرف نگاہ رکھی۔ رابعہ کی کھڑکی بند تھی۔ اوپر کے چوبارے کی کھڑکی کھلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چھٹی گلی میں داخل ہوا تو مائی نختی کی آواز سن کر ڈر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ مائی نختی اتنی لاغر اور شجیف تھی کہ چھٹی گلی کے دروازے کے ساتھ گلی ہوئی وہ ایلی کو دکھانی نہ دی تھی۔

”کون ہے؟“ مائی نختی نے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے اسے پہچانے بغیر جواب دیا۔

”میں کون۔“ اس نے پوچھا۔

”ایلی۔“ وہ بولا۔ ”سلام کہتا ہوں۔“

”ہے اپنا ایلی ہے۔“ اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرا گھر آباد ہو۔ ہے۔ اب کی بارتو بڑی دیر سے آیا ہے تو خیر سے تو ہے نا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اے اچھا کیا دیر سے آیا تو۔ یہاں روز آکر کیا کرنا ہے تو نے۔ لڑکے اپنے کام پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا جو دیر سے آیا تو۔ جان چھٹی تیری۔ اس دلدل میں پھنس کر تو نے کیا لیما تھا۔ خواہ مخواہ۔ اس کے تو پھسن ہی ایسے ہیں۔“

”ایلی اس کی بات سن کر چونکا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایلی نے اس کے بے معنی باتوں سے مخلصی پانیکے لئے بات کا رخ بدلا۔“

”تو تو خیریت سے ہے نا ماں۔“

”اللہ تیرا بھلا کرے پیٹا میرا۔“

”اچھا تو کل ملوں گا ماں۔“ کہہ کر وہ چل دیا۔

آگے مہاراج

رابعہ کا چو بارہ مغلل تھا۔ شہزاد کو حیرت سے ڈالنے کے لئے وہ دبے پاؤں اور پڑھنے لگا۔ اور پہنچ کر وہ رک گیا اور چو بارے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر شہزاد چو کی پر بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی صدر راڑروں بیٹھا تھا۔ صدر نے اپنی آنکھیں شہزاد پر گاڑ کھی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب ساتھیم تھا۔

ایلی یہ منظر دیکھ رکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھیے زینہ بیٹھتا جا رہا ہوا اور وہ گراج رہا ہو۔ اس نے بصد مشکل اپنے آپ کو سنجھا لا اور پھر آخری سیرھی پر چڑھ کر روشنی میں آ کھڑا ہوا۔

ایلی کو دیکھ کر صدر گھبرا گیا اور فوراً سرک کر پہنچے ہو گیا۔ ایک ساعت کے لئے شہزاد کی آنکھوں میں مذبذب لہرایا۔ پھر وہ سنبھل کر گولی۔

”آگے مہاراج۔“ اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

”جی۔ آگے۔“ وہ بولا غالباً اس کی آواز میں دھار تھی۔

”تو آ جاؤ۔“ وہ ہنسی۔

کتنی خوشگ تھی وہ ہنسی۔

ایلی سوت کیس اٹھائے آگے فرحت کے گھر کی طرف نکل گیا۔ فرحت اور اماں سے باعین کرتے ہوئے وہ مسلسل شہزاد کے چو بارے کی طرف دیکھا رہا کہ وہ کب آ کر اسے لے جائے۔

”چل جائے کر میلے کھلاوں۔ لوکب سے ادھر چائے بنی پڑی ہے چلو چائے تو پی لو پہلے۔“

لیکن اس روز شہزاد فرحت کی طرف نہ آئی۔ البتہ اس کے آنے کے چند منٹ

بعد صدر جھومنتا ہوا آیا اور سمجھو کی مزاج پر سی کرتا ہوا اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہی نہیں کئی ایک باتیں غیر معمولی تھیں۔ اور پھر اس کا یوں شہزاد کے اس قدر قریب نبیٹھنا اور آنکھوں میں وہ تفسم اور پھر ایلی کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹنا یہ سب باتیں بڑی عجیب تھیں۔ پھر شہزاد کا وہ روکھا لہجہ اور خلک رویہ۔ یہ سب کیا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔

اس کی نگاہوں تک مال نہ تھی اگئی۔ اے اچھا کیا جو تو دیوی سے آیا۔ ”وہ بولی ”اچھا کیا تیری جان چھٹی اس کے تو پھر ہی ایسے ہیں۔“

دنگا مان نہ تھی کی بے ربط بائیک معاافی سے بھر گئیں۔ ان میں مفہوم پیدا ہو گیا۔ خطرناک ڈاروں مفہوم۔ ایلی بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ درود دیوار گھوم رہے تھے جھول رہے تھے۔ چاروں طرف سے اندر ہیرا یورش کر رہا تھا۔ وہ دیوانہ واراٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شہزاد کے چوبارے میں جا گھے اور بآواز بلند اس سے کہے۔

”اچھا کیا جو میں دیرے سے علی پور آیا۔ میری جان چھوٹ گئی۔“

اور پھر وہ واپس آ کر آرام سے سو جائے۔

رت آئے رت جائے

ساری رات وہ کانٹوں پر پڑا رہا۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب منظر آ رہے تھے۔

اب وہ کھڑکیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے مکانات کی کھڑکیا ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں ن۔ صدر نے اپنی آنکھیں شہزاد کی آنکھوں میں ڈال رکھی ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ شہزاد اسے اشارے کر رہی ہے۔ ابھی نہیں ذرا اٹھر جاؤ۔ پچھے جا گ رہے ہیں۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزادے کے چوبارے میں آ رہا ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب اس نے شہزادے کو جگایا۔ شہزادے آنکھیں کھول دیں اور اور اس خیال پر ایسا ترپ اٹھتا۔ اگ کا ایک شعلہ نہ جانے کہاں سے اٹھتا اور اس کے تن بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

ایسا دیوانہ وار اٹھتا۔ جی چاہتا کہ دیوانہ والہ شہزادے کے چوبارے کی طرف اٹھ بھاگے اور ان دلوؤں سے سر ہانے کھڑا ہو جائے اور جب شہزادے اس کی طرف دیکھتے تو اس کے منہ پر چوک دے اور پھر واپس آ جائے لہو ایک مرتبہ یہ دیوانگی اس شدت سے مسلط ہوئی کہ وہ واقعی اور ہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا اگر وہ اکٹھے نہ ہوئے تو۔ اگر شہزادے کیلی ہوئی تو۔ یہ ذراں کے لئے سوہان روح ہو گیا اور وہ دعا میں مانگنے لگا۔ یا اللہ وہ اکٹھے ہوں۔ وہ کھڑکی پھلانگ کر آپکا ہو۔

صحح سویرے حسب معمول شہزادہ آسمانیہ مگر اس کے انداز میں نہ وہ شوختی تھی نہ رنگی۔ اس نے ایک نظر ایسا پڑا اور پھر فرحت سے مخاطب ہو کر نہ جانے کیا کہنے لگی۔ اندر سے ہاجرہ نکلی۔

”اے ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایسا آیا ہوا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کیا۔ تو کل رات بھی نہیں آئی۔“

”اب اسے آنے کی فرصت کہاں۔“ فرحت نے طنز اکھا۔ ”وہ دون گئے اماں۔ رت رت کی بات ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ شہزادہ بھسی۔ ”دون تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ دنیا کا یہی دستور ہے میں نے کہا چلو میں بھی چار روز کے لئے خوش منالوں تو کیا حرج ہے۔“

”تو بہ ہے تم سے کون بات نہ کر گی تو ناراض ہے کیا؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”ناراض تو نہیں۔“ وہ بولی ”لیکن ڈر آتا ہے۔“

”کیوں؟“

”مزاج چڑھے ہوئے ہیں کوئی بے ادبی ہو گئی تو پٹ جاؤں گی۔“ شہزادے کہا۔

”تجھے بھی کوئی پیٹ سلتا ہے کیا؟“ فرحت نے ظراپر چھا۔

”میں ہی تو بیٹھی ہوں،“ وہ بولی۔ ”ہی پہنچتے ہیں ناجنہوں نے کشی دریاں میں دال رکھی ہو۔ تم کنارے پر بیٹھنے والیاں کیا جانوں؟“

”تو پھر کیوں دال رکھی ہے سمندر میں۔“ فرحت بولی۔

”تھویر وں کامزدا آتا ہے۔“ شہزادہ بنتے کیا۔

”تو پھر روتی کیون ہو؟“

”رورہی ہوں کیا؟“ وہ تفہیہ مار کر بُسی۔

”تم خواہ بخواہ بھگڑاتی ہو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”چھوڑ واپ۔“

”آچائے پی لے۔“ فرحت نے شہزادے کہا۔

”پلاوے۔“ شہزادے جواب دیا۔ ”ہمارے ہاں کوئی پینے نہ آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہو گا۔ کیوں مہاراج۔“ وہ ایلی کی طرف مخاطب ہوئی۔ ”ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

”وکشا دونا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔

”دیں گے۔“ شہزادہ بولی۔ ”دیوتا تو بات تو کریں۔“

”یہ دیوتا پھر کا نہیں بنا،“ ایلی نے کہا۔

”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ بُسی۔

”کہہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایلی نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

”اوہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی دال نہیں گلے گی۔“

”ہاں ہاں۔“ ایلی بولا۔ ”ابھی چوہہ پر چڑھائے رکھو۔“

”ایلی سے جیتے تو جانیں۔“ فرحت بولی۔ ”ہمیں کولا جواب کرنا آتا ہے تمہیں۔“

”اگر وہ مہاراج سے کیسے جیتوں۔“ وہ بولی۔ عین اس وقت جانواگئی۔

”ہے ایلی آیا ہے۔ کب آیا تو۔ اب فی بار تقویری شکل ہی نہیں دیکھی۔“ پھر وہ شہزاد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”وہ آیا ہے۔ تیرا صدر را وہر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔

کہتا ہے شارکے ہاں جا رہا ہوں۔ بندے ٹھیک کرانے ہیں تو دیدے۔“

”ہے میں تو بھول ہی گئی۔“ شہزاد چلائی۔ ”میں ذرا بتا آؤں اسے۔“ اور پھر ایلی کی طرف دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صدر کی آمد کی بات سنتے شہزاد کارنگ ہی بدل گیا ہو۔ نہ جانے یہ ایلی کا وہم تھا یا حقیقت پر مبنی تھا کہ صدر کی خبر سن کر شہزاد کی آنکھوں میں وہی مسکراہے۔ لہرائی تھی جو کبھی اس کی آمد پر لہرایا کرتی تھی۔

چانے پینے کے بعد ایلی باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

”کہاں جائے گا تو۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”باہر جا رہا ہوں۔ لوگوں سے ملنے کے لئے۔“

”لوگوں سے ملنے کے لئے۔“ فرحت نے معنی خیز انداز سے کہا۔ ”آج لوگوں کو ملنا یاد آگیا تھے۔“

”میں نے کہا۔“ ہاجرہ بولی۔ ”تو کیا شہزاد سے ناراض ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔

”تو اوہر گیا کیوں نہیں۔“

”جاوں گا۔“

”اماں۔“ فرحت بولی۔ ”تو بھی حد کرتی ہے خواہ مخواہ۔“

”نہیں بیٹی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”نہ کسی سے اتنا بیٹا ہونا چاہئے اور نہ اتنا کڑوا۔ جا کر مل لے اس سے ورثہ لوگ کیا کہیں گے۔“

”مجھے لوگوں کی پروانیں اماں۔“ ایلی بولا۔

”دیکھوں ایلی۔“ فرحت بولی ”اب تو تعلیم سے فارغ ہو گیا ہے ابھی تجھے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ پھر اسی تجھے میں پھنس جائے گا۔ اب تو تجھے کسی نہ کسی نوکری پر چلے جانا چاہئے۔“ ایلی بولا۔

”ابھی تو نتیجہ نہیں اکلا۔ ابھی سے نوکری کہاں ملے گی۔“ ایلی اسے گھورنے لگا۔

”ابا نے ہمیں لکھا ہے کہ فوراً اسے بھیج دو۔ نتیجہ لکھنے سے پہلے ہی نوکری مل سکتی ہے۔“ فرحت نے جواب دیا۔

”ہاں بیٹا۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت ضائع نہ کرنا۔ اتنے سال ضائع کر چکا ہے اس طرح تو تیری زندگی کبھی نہیں سنو رے گی۔ تباہ رہے گی ساتھ ہماری بھی۔“

ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو کیا میری بات مان لے گا۔“ ہاجرہ نے پوچھا ”ویکھ میں اک تیری امید کے آمرے پر جی رہی ہوں۔“ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈھا آئے۔

”چلا جاوں گا اماں،“ ایلی نے کہا۔

”دوا یک دن میں نا۔“ فرحت نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولا ”دوا یک دن میں،“

”اور اگر شہزادے صلح ہو گئی پھر بھی۔“ فرحت نے چمک کر کہا۔

”اے ہے تو چھوڑو۔ خواہ مخواہ ایسی بات کرتی ہے۔ ہاجرہ بولی۔ اور دیکھ شہزادے

سے ہستے ہستے جدا ہونا غصے میں نہیں کیا فائدہ ہے؟“

”اس بے چاری نے تیرا کیا بگڑا ہے۔ اثاثے نے تو ہم سے بہت ہی اچھا سلوک کیا ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

CyberLand جنپی عورت

میرھیوں کے قریب پہنچ کر دعتا اس نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور شہزادے کے گھر کی طرف چل رہا وہ سوچ رہا تھا شاید یہ میرا وہم ہے تا حق اس پر شک کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بات ہی نہ ہو۔
اسے وہ دن یاد رہا گیا۔ جب شہزادے بائیک کا لمحہ میں جانے سے پہلے رابعے کے چوبارے میں شہزادے ملا تھا۔ شہزادے اس کے روپ و آنکھڑی ہوئی۔

”تم سمجھتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”کہ میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوں پوری کرنا تھی۔ اثاثے نے تو ہوں پوری کرنے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ میں نے اپنے خاوند سے بگاؤ کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہاں میں کس لئے بیٹھی ہوں۔ کس لئے کس امید پر۔“

ایلی گھبرا گیا۔ اسے کچھ سمجھے میں نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس کا وہم تھا۔ تا حق اس پر شک کر رہا تھا۔ جب وہ شہزادے کے کمرے میں پہنچا تو وہ چپ چاپ بیٹھی مشین پر کام کر رہی تھی۔

”یہ دیکھ کون آیا ہے۔“ جانو چلائی۔

شہزادے چپ چاپ کام کئے گئی۔

”میں نے کہا ایلی آیا ہے۔“ جانو بولی۔

”آیا ہے تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولی ”میں کیا جانتی نہیں کہ آیا ہے۔“
ایلی کو دھپ کا سالاگا۔

”چائے نہیں پلائے گی کیا۔“ ایلی نے دل کڑا کر کے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ وہ ویسے ہی کام میں مصروف بولی۔ ”جا جانو لے آچائے۔ لگا دے اس میز پر۔“

یہ انتہا تھی۔ ایلی کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے لیکن وہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ جانو چائے لانے کے لئے چیخ چلی گئی تو اس نے شہزاد پر لگا ہیں کاڑ دیں لیکن وہ اس قدر مصروف تھی کہ اس نے آنکھاٹا کر بھی نہ دیکھا۔

”یہ صغریہاں کب سے آتی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جب میں پلانی ہوں آتا ہے۔“ اس نے روف کے انداز سے جواب دیا۔

”دن میں کئے بال ریڈاٹی ہوں۔“

”جتنی باروں چاہے۔“ وہ بولی۔

”بہت دل چاہتا ہے تمہارا۔“ ایلی نے نفرت سے پوچھا۔

”اپنا اپنا دل ہے۔“ وہ بولی۔ ”مجھ پر کون بندشیں ڈال سکتا ہے۔“

ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی شہزاد تھی جو ابھی ابھی فرحت کے پاس بیٹھے ہوئے اسے دیوتا کہہ رہی تھی۔

”شہزاد کیا تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا ”کہ وہ ایک اوپاش آدمی ہے۔ شرایی ہے اور اسے کسی کی عزت کا خیال نہیں۔“

”جس کی عزت ہو وہ سوچی یہ باتیں۔ مجھے ان سے کہا۔“ اس نے جلے کئے انداز سے جواب دیا۔

ایلی اٹھ بیٹھا اور شہزاد کی طرف بڑھنے لگا۔

”نہ مہربانی کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر طرز بولی۔ ”مجھے آرام سے جینے بھی دو گے یا نہیں۔“

”لیکن تم نہیں صحیتی۔“ وہ چلا یا۔

”میں سمجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی نہ سمجھائے۔“

”تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا کسی کو حق نہیں۔“ وہ انٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی

آنکھوں سے نفرت کے شراہے تکل رہے تھے۔

”مشہدا دیتم کہہ رہی ہو۔“ وہ چلایا۔

وہ خاموش رہی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“

”میں کیا مجرم ہوں کہ جواب دیتی پھر وہیں۔“

وہ چپ چاپ پھر سے گردی پر بیٹھ گیا اور وہ مشین چلانے لگی۔ ویر ٹک وہ دلوں
چپ چاپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر کے بعد جانو کی نیچے سے آواز آئی۔

”یہ آگیا ہے صدر۔“ وہ بولی۔

”اچھا میں آئی۔“ یہ کہہ کر وہ قلائقیں بھرتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگیں

ایلی چپ چاپ اٹھا اور نہ جانے کدھر کو چل پڑا۔ اس کے حواس معطل ہو چکے
تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں ایک بھی انک خلا پھیل رہا تھا۔ اس
وقت نہ اسے غم تھانے غصہ۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق میں تبدیلی ہو چکا تھا۔ اس
کے اردو گرد چاروں طرف لاحدہ دو سعینیں پھیل گئی تھیں۔ اور ان میں ایلی گویا کھو گیا
تھا۔ وہ بو جھیل اور بھیانک خلایوں جھوول رہا تھا جیسے سمندر ہو۔ اس میں لہریں انٹھ
رہی تھیں اور ایلی کی ناؤ جھوول رہی تھی۔ بہہ رہی تھی۔ بہہ جارہی تھی۔ نہ با دبان تھے
نہ چپو۔ نہ کوئی راستہ نہ منزل۔

سارا دن نہ جانے وہ کہاں کہاں مارا مارا پھر تارہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر رک
جاتے۔

”ایلی ہے۔ کب آیا تو ارے۔“ وہ چلاتے۔ ”یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ اپنی شکل کی طرف تو دیکھ۔ بیمار ہے کیا؟“

پہلے تو اس نے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔

”ہاں بیمار ہوں۔“

”کیا بیماری ہے؟“ وہ پوچھتے۔

”بخار آتا رہا ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

لوگوں کو ایسے سوال کرتے دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام پول دیا۔ اس کا ارادہ تھا کسی کے پاس جانبیتے لوگوں سے ملے۔ رضا تو امراض رجا چکا تھا۔ چلو ہدم کی طرف ہی آہی یا بھا اور رجاء کے گھر چلا جائے۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کا چہرہ ضبط کے باوجود بھائیک دکھائی دے رہا ہے۔ وہ باہر قبر سنتاگی طرف چلا گیا اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھر تارہا۔

وہ سوچ رہا تھا میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟

شہزادوہ شہزادو نہیں تھی۔ کہاں وہ بُشتی کھیاتی مسکراتی ہوئی شہزادا اور کہاں یہ عورت۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک اجنبی عورت ہو جسے ایلی نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بُشتی تو وہ تھی مگر اس کی وہ بُنسی کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور پھر صدر کے لئے۔ ایلی کے دل میں ٹیس سی اٹھتی۔ اگر شہزادو یہی ہی ٹھکرادیتی تو اسے تکلیف نہ ہوتی۔ کسی ایسے کے لئے ٹھکراتی جو کسی حیثیت کا مالک ہوتا۔ جس کی کوئی شخصیت ہوتی۔ کچھ بھی ہوتا لیکن صدر ایک خود فرض شرابی۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا۔ اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے صدر ابھرتا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر بھری مسکراہٹ جھلکتی اور وہ ایلی کی طرف دیکھتا۔

”میں تو کہا تھا بانت کر کھائیں کتنی ملتیں کی تھیں کہ ہمیں بھی اس دلیز پر جیٹھنے کی اجازت دو۔“ وہ قہقہہ لگاتا۔ ”لیکن تم کب سنتے تھے؟“ پھر وہ ایڑیاں

الٹھا کر گانے لگتا ”حافظ خدا تمہارا“۔ اور یوں اشارے کرتا جیسے کہہ رہا
وہ ”اب چھٹی کرو بھائی۔“ پھر وہ شہزاد کی طرف متوجہ ہوتا اور دوسرا
مصرع اسے مخاطب کر کے کہتا ”اے دربار، ہوں میں فدا۔“

گھر پہنچ کر بھی ایلی کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ بہر حال ایک بات واضح تھی
اس کا علی پور میں رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اسے جانا ہی ہو گا۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔
لیکن وہ چاہتا تھا کہ یوں نہ چلائے۔ شاید کسی روز شہزاد کے ہم خود مجھے چھوڑ کر چلے
گئے تھے۔ وہ بھی کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن یہ ازام برداشت نہیں کر سکتا تھا اس
نے شہزاد سے بیوقافی کی۔

”وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ثابت کر دی کہ شہزاد اس سے بے وفا کی کر رہی
ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ بات تو واضح تھی۔ شہزاد کی ہر حرکت سے یہ
ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی تمام توجہ صدر پر مرکوز ہو چکی ہے اور اب وہ ایلی کو محض ایک
رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ڈرامائی انداز سے اس وقت ان کے سر پر جا
کھڑا ہو جب وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر رہے ہوں تاکہ وہ شہزاد کی
بیوقافی اور اپنی مظلومیت کی دھاک بٹھا دے اور پھر ایک سچے عاشق کی طرح ان
کے راستے سے ہٹ جائے اور باقی ساری زندگی اس بے وفا محبوہ کی یاد میں رو رو کر
بُر کر دے۔“

رات تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

رت جگا

فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ دونوں
ضرور ملتے ہوں گے صدر اپنی کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوبارے میں آ جاتا ہو
گا۔ شہزاد اکیلی ہی تو تھی۔ اس کی ماں بیگم کہیں گئی ہوئی تھی۔ جانو گھر کا کام ختم کرنے
کے بعد اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ صرف شہزاد اور چار بچیاں چوبارہ میں رہ جاتی

تحمیں۔ پھر رکاوٹ کو نہی تھی۔ وہ ضرور ملتے ہوں گے ضرور۔

بارہ بجے تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اس نے بہانا بنایا جیسے سورہا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھا اور دبے پاؤں شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس دروازے میں جا کھڑا ہوا جو شہزاد کے کونٹھے پر کھلتا تھا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ شہزاد کی پچیاں باہر صحن میں ہوئی ہوئی تھمیں اور وہ خود اندر کھڑکی میں کھڑی غالباً صدر سے باقیں کر رہی تھی۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور رابعہ کے خالی چوبارے میں جا کر چھپ گیا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ شہزاد کی طرف دیکھا رہا تھا وہ نہ کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے ان کی گفتگو کے متعلق سچھلم نہ ہو سکا چونکہ وہ ان سے کافی دور تھا لیکن ان کے تفہیم ایلی کو سنائی دے رہے تھے۔ وہ ملتی خوش نظر آ رہی تھی۔

پھر دفعتاً اس نے ہنسنا موقوف کر دیا اور زیرِ لب باقیں کرنے لگے۔ ضرور وہ ملنے کی تفصیلات طے کر رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد شہزاد چلائی۔

”ہے۔ آدمی رات ہو چکی ہے اب مجھے نیند آئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آخری قہقہہ لگایا اور پھر باہر چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔

دیر تک ایلی وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔

محلے پر سکوت طاری تھا۔ تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں البتہ احاطہ میں چمگا دڑیں چیخ رہی تھیں جو اس سکوت کو اور بھی بھیا نک بنا رہی تھیں۔ احاطے میں گھٹا ٹوپ اندر ہیرا تھا۔ شہزاد کے کوٹھے پر بھی خاص اندر ہیرا تھا۔ اندر چوبارے میں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم روشنی صحن کے ایک حصے میں پڑ رہی تھی۔

اگر صدر نے آنا تھا تو شہزاد نے دیا کیوں جلا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا شام کے اس لئے کہ کھڑکی پھلانگ کر آنے میں اسے وقت نہ ہو۔ وہ

کھڑکی پر نگاہیں جمائے سوچتا رہا۔ مسجد کی گھڑی نے دو بجاؤ بیئے اور وہ چونکا دونج
گئے۔

پھر وہ دبے پاؤں لکلا اور شہزاد کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ وہ بازو سرتلے رکھی ہے
خبر سورہی تھی جیسے اس کی عادت تھی۔ ایسا کاؤں چاہا کہ اسے جگا دے اور پھر اس کے
پاؤں پر سر رکھ کر رو دبے لیکن اسے شہزاد کے تیقہ یاد آ گئے۔ اسے اچھی طرح معلوم
تھا کہ ایسا دکھی ہے۔ دکھی نہ سہی چلو نا راضی تھی اور وہ جان بوجھ کر صدر کے ساتھ
تیقہ لگا رہی تھی۔ اور پھر جب وہ اس وقت اس کے پاس آیا تھا تو کس بے اعتنائی
سے اس نے کہا تھا جانو اسے چاٹے پلاو نے لجیسے کسی بھکاری کو بھیک دی جاتی
ہے۔

چند منٹ وہاں رک کر وہ شہزاد کے پو بارے میں داخل ہو گیا۔

وہاں وہ صندوقوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ بہت رات بیت
چکی اب تو شاید صدر نہیں آئے گا۔ اسے اس بات پر دکھا ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی
سب سے بڑی خوشی اس بات پر مختصر تھی کہ صدر کھڑکی پھلانگ کر آجائے۔ آ کر شہزاد
کو جگائے اور شہزاد اس کے گلے میں نہیں ڈال دے پھر ایسا چپکے سے باہر نکلے اور ان
کے رو بروآ کر کے ہے۔

”آ واب عرض ہے محترمہ۔“

اور پھر چپ چاپ اپنے گھر آ جائے اور اگلے روز صبح سوریے ہی ہمیشہ کے لئے
علی پور خیر باد کہہ دے گھڑی نے تین بجاویئے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی
آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ شاید وہ اس لئے نہیں مل رہے تھے کہ ایسا وہیں تھا اور شہزاد
کو ڈر تھا کہ کہیں بھاٹا اپھوٹ جائے _____ پھر وہ اعلانیہ تیقہ کیوں مارتی تھی
ایسا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بہر صورت کوئی ثبوت تو ضرور ہونا چاہیے۔ شاید شہزاد کے ٹرنسک میں صدر کے

محبت نامے ہوں۔ صدر نے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جیسے وہ خود شہزاد کو لکھا کرتا تھا۔

اس نے شہزاد کا صندوق کھول کر اس کی ہر چیز باہر لکال کر دیکھی لیکن اس میں کوئی خط نہ تھا ابتدہ اس میں کافی بیکار چیزیں پڑی تھیں جو کسی زمانے میں ایلی نے اسے دی تھیں مثلاً ایلی نے ایک مرتبہ شہزاد کو ایک کھلونا دیا تھا۔ سیاہ لکڑی کا بنا ہوا ایک جاپانی کمپری اور ایلی نے یہ کمپری دیتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”جانتی ہو یہ کیون ہے؟“ یہ تمہارے میاں ہیں دیکھ لو۔“ پہچان لو۔“

پھر وہ تیج تھی جو لندن ہیرے میں رہن والی بنتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹرنسک میں شہزاد نے اپنی پرانی بھتی ہوئی دو بیان میں سنjal کر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بھی ایلی شہزاد سے ملتا تو وہ تقاضا کیا کرتا کہ شہزاد اسے اپنی پرانی میلی بیان دے۔ ایلی کو شہزاد کے جسم کی بو سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی پہنی ہوئی میلی بیان پہن کر بے حد مسرت محسوس کیا کرتا تھا کہتا تھا۔ یہ بیان پہن کر محسوس کرتا ہوں جیسے تم مجھ سے بغل گیر ہو۔ اسی نے شہزاد اپنی پرانی بیان میں سنjal کر رکھا کرتی تھی کہ ایلی آئے تو اسے تھفتا دے۔

ایلی ان سب چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ان چیزوں کو دیکھ کر دکھور رہا تھا۔

ماہیں ہو کر اس نے صندوق بند کر دیا۔

دن علاوہ اس کی نگاہ لیٹر پیڈ پر پڑی۔ ہائیں۔ اس نے سوچا لیڈر پیڈ۔ شہزاد نے تو کبھی لیٹر پیڈ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اسے خط لکھنا ہوتا تھا تو وہ اپنی بچپوں کی سکول کی کاپی سے ورق پھاڑ لیا کرتی تھی۔ پھر یہ پیڈ۔

اس نے پیڈ کو اٹھالیا۔ اچھا خاصا خوب صورت پیدا تھا۔ ابھی نیا ہی تو تھا۔ صرف

چند ایک ورق ہی پھاڑے گئے تھے۔

ارے _____ وہ پیدا اٹھا کر دیئے کے پاس جا بیٹھا۔ اوپر کے ورق پر الفاظ کھدے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے کسی نے پنسل سے کسی ورق پر کچھ لکھا ہوا اور نچلے ورق پر دباؤ کی وجہ سے نشانات پڑ گئے ہوں۔
اس نے پیدا کا اور ق پا ورق پھاڑ لیا اور اسے دیکھے لگا لیکن روشنی کافی نہیں تھی اس لئے وہ کچھ پڑھنے کا بہر حال الفاظ واضح طور پر موجود تھے۔
اس نے وہ کاغذ اٹھایا اور دبے پاؤں چپ چاپ گھرو اپل آگیا۔

حافظ خدا

گھر آ کر بھی وہ حونہ کا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد صحیح ہو اور وہ کاغذ روشنی میں پڑھ سکے۔

پیدا کے اس کاغذ پر سر نامے کی جگہ واضح طور پر صفر لکھا ہوا تھا اور اختتام پر شہزادی میں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ اسے نفس مضمون کے متعلق کچھ علم ہو جائے لیکن وہ نقوش بے حد م ہم تھے اور ان سے کوئی اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔

سارا دن وہ اس خط کو پڑھنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ اس نے خورد بین مہیا کی۔ آمینہ استعمال کیا۔ اس کاغذ کی فوٹو لی اور آخرش اس پر سیاہی ملی تاکہ دباؤ سے بنے ہوئی الفاظ کی سفیدی واضح ہو جائے۔ لیکن اس کی کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی۔

اس پر دفعتا اسے غصہ آ گیا۔ میں بھی کمینہ ہوں وہ سوچنے لگا۔ جو ثبوت مہیا کر رہا ہوں کیا شہزادی کی ہر حرکت ایک واضح ثبوت نہیں ہے۔ کیا اس کا بر تاؤ واضح ثبوت نہیں ہے تو پھر ثبوت کیوں۔ یہ سوچ کر اس نے اماں کو بلایا۔

”اماں۔“ وہ بولا ”اماں۔ میں خان پور جا رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کب؟“

”آج رات کی گاڑی سے۔“

”آج، وہ گھبرا گئی۔“ اے ہے دوچار دن تو رہ لے۔“

”اماں تم بھی حد کرتی ہو۔ اگر وہ خوشی سے جاتا ہے تو روکنیں۔“ فرحت بولی۔

”تو خوشی سے جا رہا ہے ایلی؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”تو کیا مجبوری سے جا رہوں؟“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو شہزادے نا راض ہو کر تو نہیں جا رہا؟“ ہاجرہ بولی۔

”واہاماں۔“ فرحت چالی۔

”بے کوئی بڑی بات کروہی ہوں کیا؟“ ہاجرہ نے معصوم انداز سے کہا۔

”تو بھی بڑی جھوٹی ہے ماں۔“

”مجھے نہیں آتیں شیرھی باتیں۔“ ہاجرہ نے کہا۔ بے کی سے نا راض ہو کر کیوں جدا ہو کوئی۔“

”تو پھر ان دونوں کو مناوے۔“ فرحت ہنسنے لگی۔

”ہاں ہاں۔“ ہاجرہ بولی ”اس میں کیا ہرج ہے۔“

”تو اس کی باتیں نہ سن ماں۔“ ایلی نے کہا۔

”مجھے نہیں سمجھ میں نہیں آتیں یہ باتیں۔ میرا دل تو صاف ہے۔“ ہاجرہ بولی۔

”کچھ زیادہ ہی ساف ہے ماں۔“ فرحت ہنسی۔

”چل میرے ساتھ شہزادی طرف۔“ ماں نے فرحت کی بات پر غور کئے بغیر کہا۔

”نہیں اماں چھوڑ اس بات کو۔“ ایلی گھبرا کر بولا۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو جانو نے شور مچا دیا۔

”کچھ خبر ہے یا اپنی دہن میں غرق رہو گی۔“ وہ شہزادے کہنے لگی جو اس وقت صدر سے بالتوں میں مصروف تھی۔

”کیا ہے؟“ شہزاد بولی۔

”ایلی خان پور جا رہا ہے۔“

شہزادے قہقہہ لگایا ”تو پھر؟“

”اے میں کہتی ہوں واقعی جا رہا ہے۔“ جانو چلانی۔

چھڑا اپھر نہیں۔ ”تو کیا کروں؟“ وہ بولی ”کیا گھوڑا کاڑی جوت کر لاؤ۔“

”ہے کیا باتیں کر رہی ہے تو۔ ابھی کل تو _____،“ جانور ک گئی۔

”بہت منادیکھا میں نے۔“ شہزادے کہا ”اب نہیں _____“

ایلی نے سننا اس کے دل پر کسی نے گویا جلتی ہوئی میخ گاڑ دی۔

محلے کے چوگان میں محلے والیوں نے ایلی کو رک لیا۔

”کون جا رہا ہے ماں؟“ ایک کھڑکی میں آنکھی ہوئی۔

”اپنا ایلی ہے۔“ ماں نے کہا۔

”جا رہا ہے۔ علی پور چھوڑ کر جا رہا ہے۔“ دوسرا بولی۔

”ہے شہزادے کی کھڑکی خالی ہے۔“ ایک نے طعنہ دیا۔

”وہ ادھر دوسرا کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔ اس لئے۔“

”ہے کتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں اس کے چوبارے میں۔“

”بارہ دری ہے ماں۔“ وہ قہقہہ مار کر نہس پڑی۔

”ایک دن جانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔“ ماں بولی ”چلو اچھا ہی ہوا تو بھی کام کا ج پر

لگے گا۔“

ایلی کا سر جھک گیا۔ اے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب نے گور کی لوگری اس کے سر پر گردی ہو۔ شرمساری اور ذلت سے لت پت وہ چل پڑا۔ اس کے قدم یو جھل ہو رہے تھے۔ گردن کامنکا گویا ٹوٹ گیا تھا۔ سامنے ایک خلا تھا۔ ایک دھند لکھاری کی جو منہ کھولے پڑتی تھی۔ دور صدر کا گراموفون چلا رہا تھا۔

حافظ خدا تمہارا۔ اے درباہوں میں فدا۔

بن باسی

خانپور جاتے ہوئے ایلی کے دل میں غم بوند بوند گر رہا تھا لیکن دراصل اس غم کی حیثیت ناٹھی۔ اسے شہزادے جدائی کا غم نہ تھا۔ شہزاد کی محبت کھو دینے کا صدمہ تھا بلکہ احساسِ ندامت اور شکست کی وجہ سے اس کا دل چور چور تھا۔

ایلی جذبِ عشق اور احساسِ غم سے بیگانہ تھا۔ اگر وہ عشق یا غم سے محروم نہ ہوتا تو یہ واقعہ اس کے کردار میں ایسی گہرائی پیدا کرتا جو اپنی نوعیت میں تغیری ہوتی۔ اس کے بر عکس وہ محبوں کر رہا تھا کہ دیوتا پتھر کے ٹکڑے کی طرح ٹھکرا دیا گیا۔ اور اب وہ دیوتا نہیں محض ایک پتھر ہے جو لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا ہے۔ آج تک اس کی تمام تر اہمیت کا انحصار شہزاد کی توجہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے تھا۔ — اب وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہ تھا۔

گاڑی فرائٹ بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ گاڑی کی چپکا چپک کی آواز اسے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے شہزاد اور صدرِ قبیلہ مار کر نہس رہے ہوں۔ سمجھی اس پر نہس رہے تھے۔

”آخر ایک نہ ایک دن جانا ہی پڑتا ہے۔“ ماں نتھی مسکرائی رہی تھی۔ ”ایسے اعمال کا بھی نتیجہ ہوتا ہی۔“ پچھا صمد چلا رہا تھا۔

”بہن اس کے چوبارے میں تو کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں۔ بارہ درجی ہے۔“
”جارہا ہے تو میں کیا کروں؟“ شہزاد رہنس رہی تھی۔

”حافظ خدا تمہارا۔“ صدرِ قبیلہ مار رہا تھا۔
اور نجف وہ خان پور پہنچ گا تو علی احمد نہیں گے۔

”لو بھئی نصیر احمد کی ماں۔ ایلی آگیا۔ آخر آہی گیا۔ ہی ہی ہی بھئی بڑی ہمت کا کام کیا ہے ایلی نے سنتی ہو نصیر کی ماں۔ کارنامہ دکھایا ہے ہی ہی ہی۔ وہاں سے چلے آنا کوئی آسان بات تھی کیا؟“ — اونہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم تم

کیا جانو۔“

اس کی آنکھ میں چمک لہرائے گی اور پھر وہ جھک کر راجو کے کان میں کھیس گے:

”تمہیں کیا پتہ مرد کی مجبوریاں۔ تم خود مجبوری ہو۔ ہی ہی۔“

ایلی کو خانپور جانے سے ڈر آتا تھا۔ علی احمد کے رو برو جانے سے ڈر آتا تھا۔ اگر چ علی احمد نے واضح الفاظ میں ایلی کو کبھی شہزاد کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان کی بنسی میں وہ ہمیشہ دھار محسوس کرتا تھا۔ ان کی خصوصی بنسی ایلی کے لئے کندھ پھری کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے راستے میں وہاں یک روز کے لئے لاہور رک گیا۔

پنچھر

لاہور شہر نے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس لئے وہ سیدھا داش مسلم ہوٹل چلا گیا اور کمرے میں سامان رکھ کر وہ چار پالی پر ڈیپر ہو گیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ گھر سے باہر کلا ہو جیسے پہلی مرتبہ ایک بچہ انگلی کا سہارا لئے بغیر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

انگلے روز وہ لاہور میں گھومتا رہا یوں جیسے ایک بیگانہ شہر ہو۔

سنٹرل ٹریننگ کالج ویران پڑا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک اجنبی مقام پر ہو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی چند روز پہلے وہ اسی بیورڈنگ میں رہتا تھا۔ وہ چھوڑ کیاں وہ شام۔ جی کے لا جوئی سب اس کے ذہن میں دھندا چکے تھے جیسے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہو۔

شام کے وقت جب وہ انارکلی میں گھوم رہا تھا تو دفعتاً کسی نے آ کر اس کے شانے پر ہاتھ درکھدیا۔

”اے تم؟“ کوئی چلایا۔

”شام،“ ایلی کی چیخ نکل گئی۔ ”تم یہاں ہو؟“

”ہم اب کہیں جانے کے قابل نہیں رہے۔ بس اب تو نہیں اپنا مقبرہ بنے

گا۔ ”شام مسکرار ہاتھا۔

”کیوں؟“

”بس سگ ناقہ لیلے۔“ ”شام ہنما۔“ وہ میرے لئے بیہیں رک جائے تو پھر میں

کہیں جا سکتا ہوں کیا؟“

”رک گئی ہے؟“ ایلی بولا۔

”ہاں۔ اس نے یہاں نوکری کر لی ہے۔“

”اور تم؟“

”میں نے الاعکان جائز کرایا ہے۔ کافی تو بہانہ ہی ہے۔“ ”شام نے آنکھ ماری

۔“ مطلب ہے جہاں فیڈنگ بوقت میں گلیکو بے بی۔

شام ایلی کو اپنے نئے بورڈنگ میں لے گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچتے ہی جب اس نے روشنی میں ایلی کی طرف دیکھا تو چلانے لگا۔

”ارے تم۔ تمہیں کیا ہوا؟“

”مجھے۔“ ایلی نے جھوٹ موت دہرایا۔ ”کیوں مجھے کیا ہے؟“

”دایہ سے پیٹ چھپاتے ہو۔“ ”شام چلایا۔

”تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

شام کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

” بتاؤ؟“ وہ بولا۔

”ہاں بتاؤ۔“

”ٹھس سس سس۔“ وہ چلایا۔ ”پنچھر۔“

”پنچھر،“ ایلی نے باوٹی حیرت سے دہرایا۔

”وہ پنچھر ہوا ہے کہ ساری ہوا نکل گئی ہے۔“ کیوں اب بولتے نہیں۔

”شام چلایا۔“ ”بولونا۔“

”چج کہتے ہو۔“ ایلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ارے۔“ شام اس کی آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

سب ختم ہو گیا۔ ایلی بولا ”وہ تخت وہ تاج و شہنشاہی سب۔ صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔ اور شاید میں بھی ختم ہو جاؤں۔“

”زہر۔“ شام نے بات کو مذاق میں نالے کے لئے کہا ”ابھی تک میرے ٹرنک میں پڑی ہے اور رالیاس بھگوان کی سو گند بس ساری عمر ٹرنک میں پڑی رہے گی۔ نبھجیں کھانے کی ہمت ہوئی نہ تم میں ہو گی۔“ وہ دشمنے لگا۔

”غہمیں شام، ایلی بولا“ صاری زندگی چوپٹ ہو گئی۔ بساط اہلِ کتب اب جینا بے کار ہے۔“

”اس کے باوجود جئے جاؤ گے بینا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی پڑ سے چلت ہو جائے گی۔ بساط پھر قائم ہو جائے گی۔ غم نہ کھاؤ۔“
”غم تواب لگ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ شام نے کہا۔
ایلی نے اثبات میں اشارہ کیا۔

”اس نے پے وفاتی کی۔ بس یہی بات ہے نا؟“

”ہاں۔“ ایلی بولا ”پہلے تخت پر بٹھایا۔ پھر مورچھل کرتی رہی اور پھر دھکاوے کر وہاں سے گرا دیا۔“

”بس تم سمجھ لو روشنی منی بن گئے۔ تمہارا کلیان ہو گیا۔“

”کیوں؟“

”جس نے کامیابی دیکھی۔ تخت پر بٹھایا گیا۔ مورچھل کروایا۔ وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک اسے عروج پر سے گرا یا نہ جائے۔ سمجھ لو تمہارا کلیان ہو گیا۔ اُو تمہیں بیکار پلاوں۔“ وہ چلانے لگا۔ ”لا جواب چیز ہے پچھر لگ جائے گا۔ پھر تخت پر بٹھادے

گی۔ مورچھل کرے گی۔ آؤ یار۔ اب اپنا آپ سن جاؤ۔ ”شام کہنے لگا۔“ جو تیاں کھانا تو اپنا پاپیشہ ہے۔ تم تو یون شکل بنائے ہوئے ہو جیسے پہلی بار جوتا کھایا ہو۔ ہمت کرو۔“

”مجھے نصیحتیں کرتا ہے جے سانے۔“ یاں جلال میں آگیا۔

”کر لینے دو۔ کربن لینے دو۔“ شام چلا یا۔ ”تمہارا کیا جگڑتا ہے۔ میری نصیحتوں سے تم نے کوئا اثر لیا ہے۔ لیکن اپنی بات بن رہی ہے۔ کر لینے دو نصیحتیں مجھے۔“

”کیوں؟“ یاں نے پوچھا۔ ”یاں“ یاں عمر بیت اشیٰ لہی۔ ہمیشہ مجھے ہی پچھر ہوتا رہا۔

ہمیشہ لوگ مجھے ہی نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ جگوان جانے یہ پہلا موقعہ ملا ہے جب میں تمہیں نصیحت کر سکتا ہوں۔“

دل چھوٹا نہ کرو۔“

”بائے بائے۔“ ہوٹل میں پہنچ کر شام چلا یا۔ ”چار بوٹل۔ اچھی سی لانا۔“ وہ ہنسا۔ ”تیزی سی جو تخت پر بٹھائے اور مورچھل کرے۔“

خانپور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے جمیل مل گیا۔ جب ایلی پلیٹ فارم پر قلی ڈھونڈ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ بریک کے قریب جمیل کھڑا ہے۔

”اے تم۔“ وہ حیرت سے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔

جمیل مسکرا رہا تھا۔

”میں تو یہیں ملازم ہوں۔ ابھی ٹھہر واکھے چلیں گے۔“

خانپور کے اس صحرائے اعظم میں جمیل ایلی کے لئے واحد نخلستان تھا۔ اگر چاہیل کو جمیل سے جواب سامحسوس وہ رہا تھا۔ چونکہ جمیل صدر کا چھوٹا بھائی تھا اس لئے وہ جمیل پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کیا المیہ واقع ہوا ہے۔

آج تک ایلی نے شہزاد کو راز بنائے رکھا تھا۔ اس نے شہزاد کے متعلق اپنے کسی

دوسٹ سے بات نہ کی تھی۔ لیکن اب اس عظیم شکست کے بعد اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسر کو روکرا پنی کھانا نئے اور راہ چلوں کو بتائے کہ اس نے ایلی سے کیا سلوک کیا ہے۔ ہر ملنے والے کو خبردار کرے کہ کبھی کسی عورت پر بھروسہ نہ کرے کبھی اس کی محبت پر اپنی خوشی کا انحصار نہ رکھنا۔ لیکن ایلی یہ بات جیل سے نہیں کر سکتا تھا۔ صدر کے چھوٹے بھائی سے یہ بات کرنا۔ یہاں سے گوارانہ تھا۔

محفل

علیٰ احمد سے گھر میں کہی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مثلاً ان کی تیسری بیوی شیم جو شیر کے سبب کھا کھا کر پائی تھی۔ اور علیٰ احمد کے گزشتہ بیان کے مطابق بذاتِ خود ایک سبب تھا اب قطعی طور پر اپنی شخصیت کو چکی تھی۔ کشمیر کا یہ سبب اب گل سڑ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس حد تک اعتراف شکست کر چکی تھی کہ اب اس میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ قالبنا امیدی اور ماہی کی شدت کی وجہ سے اس نے اپنی آپ مسخ کر لیا تھا۔ از خود۔

علیٰ احمد کی چھوٹی بیوی راجو جو کسی زمانے میں دور ہے کی رانی تھی اب چار دیواری سے گھرے ہوئے گھر کی خاتون بن کر رہ گئی تھی۔

نہ تو اس کی نگاہوں میں شو خی تھی نہ انداز میں نمائش اور نہ چال میں مٹک جو نگاہوں کو دعوت دیتی ہے۔ اس کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ ٹین کا سپاہی ابھی تک اس قلعے کی تحریر میں جوں کا توں منہمک تھا۔ اس کے علاوہ علیٰ احمد کے گھر میں اب استانیوں کی آمد و رفت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے علیٰ احمد نے خود ہی اس رسم کو توڑ دیا ہو یا شاید اس کی وجہ راجو کا رو یہ ہو۔ بہر حال علیٰ احمد کا گھر اب ایک گھر تھا۔

گھر میں علیٰ احمد تھے۔ شیم اور اس کی دو بیٹیاں۔ ناظمہ اور انجم اور راجو کے دو بیٹے شیر علیٰ جو اس کے پہلے شوہر سے تھا اور نصیر جو علیٰ احمد سے تھا۔

وہاں پہنچ کر دو ایک روز تو ایلی کھویا کھویا رہا۔ پھر محض اتفاق سے اس کی توجہ کتاب پر مرکوز ہو گئی اور وہ شہر اور کو بھولنے کے لئے اپنے کھونے ہوئے تخت و تاج کو بھولنے کے لئے کتاب میں کھو گیا۔

سارا دن وہ کتاب میں پڑھنے میں مصروف رہتا اور جب مطالعہ سے اکتا جاتا یا جب سادی اور شہر اور کتاب کے صفحات سے جھانک گر منکرا تھیں، اشارہ کرتیں تو وہ کتاب پھینک کر جمیل کی طرف چلا جاتا۔ اور جمیل فارغ ہوتا تو وہ اسے اپنے دوستوں کی مخلق میں لے جاتا جہاں وہ تاش کھیلتے، پیسے ہائکتے اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے۔

جمیل کے ساتھی تو ہفت تھے لیکن ان میں سرف دو ایسے تھے جنہوں نے ایلی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ نقی اور راز۔

نقی اور عیز عمر کا دبلا پنلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا۔ جسم مخفی تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ناک اس حد تک ابھری ہوئی تھی کہ سوائے ناک کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کی باقی میں بے حد و لچسپ تھیں۔ ان میں رنگی یا مزاح کی جھلک نہ تھی۔ اس کے روکس ان میں گہرائی ہوتی اور نقی کویا حساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی اچنچھے کی بات کر رہا ہے یا اس کی شخصیت میں انوکھا پن ہے۔ وہ یوں بات کرنا جیسے عام سی بات کر رہا ہو۔ اور جب لوگ اس کی بات پر چوٹکتے تو وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔

”ہاں یا ر۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا ”مجھے احساس نہ تھا کہ میں اتنی بامعنی بات کر رہا ہوں۔ میں تو ویسی ہی بن سوچے سمجھے بر سبیل مذکورہ کچھ کہنے کے لئے بات کر رہا تھا۔“

مثلاً اگر وہ دفعتاً خاموش ہو جاتا تو جمیل پوچھتا:

”کیونکی! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟“

”نقی چونکتا“ کیا میں واقعی سوچ میں پڑا تھا،“

”ہاں ہاں۔“ راز چنکی بجا کر گلگنا تا ”کس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا ہے۔

اس پر نقی چیختا ”یار اس کا الگامصرع کیا ہے؟“

رازا پنے آپ پر کیفیت خارجی کر کے چکھوں میں مستقی پیدا کر کے دوسرا صرع گاتا۔

”لبیر کا کہا کرنا یاد کا کہا کرنا۔“

”انہوں نے نقی چیختا۔“ بات نہیں بنی۔ کش کمش کا سوال ہی پیدا ہوتا۔ بھائی لبیر کا کہا کرنا۔ اور کیا؟“

”تم نے یہ تو بتاتا ہی نہیں کیا جوچ رہے تھے۔“ جمیل اسے چھیرتا۔

”مہمہرو۔“ نقی چیختا ”ایک سینکند ہاں ٹھیک ٹھیک سوچ رہا تھا میں واقعی۔ ٹھیک سوچ رہا تھا کہ کیا واٹھی مجھی میں اس قدر ضبط ہے کہ دو دن بیوی کو پہنچ بغير رہ سکوں۔“ نقی اس قدر مخصوصیت سے کہتا جیسے بیوی کو پہنچانا خاوند کیے لئے نارمل بات ہو بلکہ اس کا فرض ہو۔

یاراہ چلتے ہوئے دفترا نقی رک جاتا۔ ”یارا عجیب بات ہے۔“ وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا۔ ”ہے نا عجیب بات۔“

”کیا بات ہے؟“ ایلی پوچھتا۔

”یار حد ہو گئی۔“ نقی سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے کہتا۔ ”یہ جو ناک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی ہویلی ہے نا۔ یہ سامنے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حویلی سے پورے طور پر واقف ہوں اور اس کا ایک ایک کمر اور دالان جانتا ہوں۔ حالانکہ میں کبھی اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے اسے باہر سے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس راستے سے کبھی آیا ہی نہیں میں۔ ہے نا عجیب بات۔“ یہ کہہ کر نقی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کہتا: ”داخ ہوتے ہی ڈیورٹی ہے۔ دو دروازے ہیں۔“

بایاں دروازہ ایک کرے میں کھلتا ہے۔ اس سے متحققاً ایک دالان ہے۔ دالان میں
ہر نکے سینگ دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔“

”اے۔“ راز چلاتا۔ ”اب ختم بھی کرو گے یہ رام کہانی۔ جانتے ہو تم حویلی کو تو

پھر کیا ہوا؟“ ”چھوڑا ب۔“

”نہیں یار۔“ وہ چلاتا۔ ”ایسا کیوں ہے۔“ وہ ضدی بچے کی طرح اڑ جاتا۔

اس پر جمیل تھقہہ مارتا:

” بتاؤ یار کوئی اسے کہ ایسا کیوں ہے ورنہ یہ اڑ کر نہیں کھڑا رہے گا عمر بھر۔“

”اے یار چھوڑا ب اس قصے کو۔“ راز چلاتا ”سن تو ہمیں شعر سناؤ۔“ اور وہ

اپنے مخصوص اندازے ٹکنائے لگتا۔

تلخ گھونٹ

نقی کے مشاغل بے حد و لچپ تھے۔ وہ حقہ پیتا تھا۔ چائے کا شو قین تھا۔ بحث
میں بڑے شوق سے حصہ لیتا تھا۔ شطرنج اور تاش کھیلتا تھا۔ شعر کہتا تھا اور فرصت کے
اوقات میں کپڑے پر سوئی تاگے سے رنگیں چڑیاں کاڑھتا تھا اور ہر رات بیگم کو پیٹتا
تھا۔

راز کو گانے کا شوق تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کی آنکھوں میں عجب مستی چلکتی۔
برج کھیلنے کا شو قین تھا بشرطیکہ سٹیکس سے کھیلا جائے اور شوق کے باوجود ہمارے لگتا تو
دفعاً یا تو اسے کامیا دا جاتا اور یا ویسے ہی کھیلنا چھوڑ دیتا۔ اس کی باتیں رنگیں ہوتی
تھیں۔ اپنے والد صاحب کے متعلق قصے سنانے کا خط تھا جو بنگال کی طرف کسی
علاقوں میں بڑے عہدے پر مامور تھے۔

جمیل ایک خاموش اڑ کا تھا لیکن اس کا دل جذبات اور ذہن خیالات سے بھرا ہوا
تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن جہاں تک بات
کرنے کا تعلق تھا اس پر ایک جا ب مسلط تھا۔ اس جا ب کی وجہ سے اس کی طبعی جولانی

گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ احساسِ کمتری کی شدت تھی۔ وہ ملنسار تھا لیکن اس کی یہ عادت گونے پن کی وجہ سے اذیت میں بدل چکی تھی۔ پھر ایک روز اسے اتفاق سے اس اذیت سے نکلنے کا ایک راستہ مل گیا اور اسے علم ہو گیا کہ شراب کے چند گھونٹ پینے سے وہ اپنے گونے پن کو دوور کر سکتا ہے اور سوسائٹی میں ایسے ہی چمک سکتا ہے جیسے رازِ چہرہ کا کرتا تھا۔ غالباً اس سے پہلے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا دل اور ذہن جذبات و خیالات سے بھرے ہیں۔ اس روذہ سے اپنے خیالات و جذبات اپنی زبان سے من کر جیرت ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے چھپے ہوئے خزانے کی کنجی پائی ہے۔

نقی کو شراب سے خالص و پیش نہ تھی چونکہ اس کی شخصیت ہی میں مستی کا عنصر تھا۔ راز کے لئے شرابِ محض ایک پھل بھری کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کھینا اسے پسند تھا لیکن اس پھل بھری کی حیثیتِ محض تفریجی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس کا محتاج نہیں تھا۔ ایلی کے لئے شراب کا اثر خاصہ تکلیف وہ ہوتا تھا پی کر اسے وہ دن یا دو آجاتا جب وہ اور منصر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب منصر نے چلا کر کہا تھا

”بیڑا دو بڑے۔“

اور ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ شراب پلانے سے منصر کا مقصد صرف یہ ہے کہ تر جنگ میں آ کر ایلی سادی کے اس رومان کا راز کہہ دے اور ایلی نے عزم کر لیا تھا کہ چاہے وہ نئے میں دھت ہی کیوں نہ ہو جائے وہ منصر کو حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کرے گا اور یہ سوچ کروہ پتھر بن گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی اسے شراب پینے پر مجبور کیا جاتا تو اس پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتا جیسے اس کے ساتھی منصر ہوں اور اس کا راز پالینے کے لئے زبردستی پلا رہے ہوں۔

ایلی نے ڈنی طور پر اپنے اپنے آپ کو کوئی بار سمجھایا تھا کہ یہ خیال غلط ہے وہاں

کوئی منصر نہیں۔ پینے سے مقصد صرف تفریح ہے لیکن سب بیکار۔ گلاس ہونٹوں سی لگاتے ہی خواہ مخواہ وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزادی کی بات نہ چھیڑ دے۔ بہر حال شراب ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو چکی تھی۔ اس کے لئے وہ گھونٹ تلنگ بن جاتا۔ جس کے بعد اس پر جمود طاری ہو جاتا۔ جسم منوں بوجھل ہو جاتا۔ سر چکراتا۔

ایلی کے لئے جمیل، آنکی اور راز کی مخفیں یوں تھیں جیسی کسی طوفان زدہ ڈولتی ہوئی کشتی کے لئے کنارہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اسی مخفیل میں بیٹھا رہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو نہ جانتے کہنے صول کے تحت انسے اپنی گزشتہ بتاہی پھر سے یاد آ جاتی اور وہ مخفیل میں بیٹھ کر پھر سے اپنے آپ میں گھو جاتا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر سے طوفان پینا شروع کر دیتا۔

ایلی نے اپنا راز جمیل سے نہ کہا لیکن جمیل کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب جانتا ہو۔ سمجھتا ہوا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ خود جمیل نے کبھی شہزادی کی بات نہ چھیڑی تھی۔ جمیل نے ایلی کو کبھی نہ جتنا لیا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ اسی مزید دکھنے ہو۔ جمیل نے ایلی کی آمد پر اس کی کیفیت بھانپ کر خاموش بے لالگ ہمدردی کی گود پھیلا دی تھی اور شاید اس گود نے ایلی کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

ایلی کی آمد پر جمیل کی تمام توجہ ایلی پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ اپنی گونگی مٹھاں سے اس کی تلخی اور افطراب کو دور کرتا اور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ اس پر جمیل کی بیوی جو طبعاً خاوند کو جذب کر لینے کے قابل تھی۔ بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیل کے گھر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

گھر میں اسے کتابوں میں منہمک دیکھ کر علی احمد ہشتے:

”وَيَكُونُ نَصِيرَكَ مَا! هَارَا إِلَيْيَ عَجِيبٌ شَهِيْهِ“

سینما دیکھتا رہا اور اب جب پڑھنے کے دن ختم ہو چکے ہیں تو کتابوں کا کیٹرا بنا ہوا ہے۔ ہی ہی ہی ” وہ ہنتے ” ” کیوں ایلی؟ ”

” اب اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔ ” راجو ہتھی۔ ” اب اس کی شادی کی فکر کیجئے نا ”

” یہ کسی کی شادی کا فکر کیوں کرنے لگے۔ ” شیم بولتی ” یہ تو اپنی ہی تانک جھانک میں لگ رہتے ہیں۔ ”

” نصیر کی ماں۔ ” وہ ہنتے ” اسی کے لئے تانک جھانک کرتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو اپنے لئے کرتا ہوں۔ لا حول ولا قوۃ“ وہ چلاتے۔

” وہیں کیوں نہیں کر رہے ہیں جہاں وہ چاہتا ہے۔ ” راجو بولتی۔

” وہاں کیسے کر سکتے ہیں۔ ” علی احمد جواب دیتے۔

” کیوں نہیں کر سکتے؟ ”

” وہ لوگ تو بہت بڑے ہیں اس لئے۔ ”

” پھر کیا ہوا؟ ” شیم بولتی۔

” میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاض۔ ” راجو ہنستی۔

” بھائی تمہارے ہی بھلے کا سوچتا ہوں۔ ” علی احمد منہ پکا کر لیتے۔

” ہمارے بھلے کی۔ وہ کیسے؟ ”

” بھائی۔ ” علی احمد جواب دیتے۔ ” اگر وہاں ایلی کا بیاہ کر دوں تو کیا وہ تمہاری قدر کریں گے نصیر کی ماں! تمہیں دیکھ کرنا کب بھوں چڑھائیں گے۔ کہیں گے یہ کیا شیز ہے نہ شکل نہ صورت نہ منہ نہ ماتھا نہ تہذیب نہ تعلیم۔ یہ کیا چیز ہے ہی ہی ہی وہ ہنتے ” لو بھائی شیم! تم ہی الصلاف کرو۔ میرا کیا ہے۔ اپنا گزار تو ہو جائے گا۔ چند جماعتیں بھی پڑھی ہیں۔ اچھی برمی بات بھی کر لیتا ہوں لیکن نصیر کی ماں کا کیا ہو گا۔ ہی ہی ہی۔ اب نہیں بولتی۔ ہو گئی بولتی بند۔ ” ان کا قہقہہ گونجتا۔

”آپ سے کون سر کھپائے۔“ راجو جواب دیتی اور پھر اندر چل گئی۔
اس پر علی احمد بھی اپنی میلی دھوتی سن جاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

”اب دے نا جواب۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

”نه میں نہیں دیتی۔“

”کیسے نہیں دے سکتے۔ آئی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”چھوڑو بھائی۔“ اندر راجو تک کرنخے سے کہتی۔

”حافظ قرآن ہوتی تو چھوڑ دیتے لیکن تو کیا سمجھے گی اب لطیف اشارے کو۔

ذات کی ہوئی رنگارپای دوست پور میں۔ آئی ہی ہی ہی۔“

دنلا شیم اور اس کی دو فون بچیاں ناظم ار واختم محسوس کرتیں کہ ٹین کا سپاہی نہ مو
دار ہو رہا ہے اور وہ گھبرا کر گھسک جائیں اور اندر را پنے کمرے میں جاننا ہے اسی میں اور ایلی
کو سمجھو میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور وہ انٹھ کر جمیل کی طرف چل پڑتا۔

دیپاں پور

چار ایک ماہ خانپور کے بعد ایلی کی تعیناتی دیپاں پور ہو گئی۔

دیپاں پور ایک وسیع صحراء تھا جس میں یہاں وہاں دور دور مکانات بننے ہوئے
تھے۔ اس وسیع صحرہ کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا کہ جیسے بُخ تلاab میں آپنچی ہو۔ ایلی
ذہنی طور پر خود ایک ویرانہ تھا دیوانہ ویرانے میں مل گیا۔ اسے ریت کے اس پھیلاؤ
کو دیکھ کر سکون سامحسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنے گھر آگیا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایلی نے جانا
کہ خانپور میں محفل جما کر اپنے آپ کو بلانے کی کوشش غلطی تھی۔ اس کی زندگی میں دو
رنجی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل کے ویرانے کو بھولنے کے لئے نخلستانوں کا متلاشی تھا۔
دیپاں پور پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اپنی اصلاحیت کو بھولنے کی کوشش سے
سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصلاحیت میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے
تسلیم کر لینے میں راحت ہے جیسا کہ نہیں۔

دیپاپور میں اس کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ کوئی دوست نہ تھا اس لئے وہ اکیلا رہتے کے تو دوں کی طرف نکل جاتا اور پھر کسی ملہ نما تو دے کے سامنے میں بیٹھ کر ماضی کی یادیں کھو جاتا۔

ان دونوں وی سادی کو بھول چکا تھا۔ اس کے صبح و شام شہزاد کے خیال سے پڑتھے۔ شہزاد اس کی زندگی پر یوں مسلط و محیط تھی کہ کسی اور کسی گنجائش نہ رہی تھی۔ سادی کا خیال ایک مرتب بھرا جام تھا۔ جس میں رنگ تھا لطافت تھی۔ اس کے روکس شہزاد کے خیال میں تختی تھی دھکھا اور آئی لئے شدت تھی۔ شہزاد نے اسے بے عزت کر کے اپنی محفل سے نکال دیا تھا۔ اس کے احساس خودی پر کاری زخم لگایا تھا، جسے یاد کر کے وہ ترتیباً تھا اور اس ترتیب میں اور شدت کی وجہ سے شہزاد کا خیال اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ ایلی دراصل ایک غم خور نوجوان تھا اور اس کا ایمان تھا کہ عشق کو محرومی اور غم سے تعلق ہے۔ اس کے روکس مرتب اور خوشی مجنح تھیں یا عیاشی کا نام ہے۔ شہزاد سے ایلی کی محبت اب عشق میں بدل ٹکی تھی۔ اس لئے آہیں بھرنا، رہیت کے تو دوں تسلی بیٹھ کر رونا، کروٹیں لینا اس کا محبوب مشغله بن چکا تھا۔ اس کے علاوہ شہزاد کا خیال آتے ہی اسے اپنے رقیب کا خیال آ جاتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ نگاہوں میں نگاہیں ڈالے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ نفس رہے ہوں گے۔ اشاروں میں باقیں کر رہے ہوں گے عہدوں پیان۔

اب وہ مل رہے ہوں گے قریب اور قریب۔

ایلی کے دل پر ایک چوتھی لگتی۔ وہ گھاٹل ہو کر ترپتا۔ اس ترپنے میں اسے لذت میں اسے لذت محسوس ہوتی یا شاید دل ہی دل میں وہ انتقام لینے کے آرزو کو پال پوک رہا ہو۔

دیپاپور میں پہلی مرتبہ اسے بچوں کو پڑھانے کا موقعہ ملا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ وہاں کے بچے قطعی طور پر بچے نہ تھے۔ نویں جماعت کے طلبہ ایلی سے زیادہ طاقت

ورا اور قد میں لمبے تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ جماعت میں داخل ہوا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔ اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ دوسروں کے متعلق سوچے۔

اس کے ہم کارا ساتھہ سب کے سب کو یا ایک سانچے میں ڈھلنے تھے۔ ان کی چال ڈھال بول چال میں ایک سمجھی اور مصنوعی وقار تھا۔ ان کی حرکات بھدگی اور بے جان تھیں۔ روزانہ کے خیالات ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو ہو کے یہیں تھے۔

محمود

سارے مدرسے میں صرف ایک شخص تھا جس کا انداز مختلف تھا۔ اس کا نام محمود تھا اور وہ سکول کا گلرک تھا۔ شاید اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ وہ استاد تھا۔ تو کیا اساتذہ کا وہ رو یہ اور انداز پھوٹ کو پڑھانے کے مشغله کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ ایلی گھری سوچ میں پڑ گا۔

اس کے علاوہ محمود کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ وہ غنوان شباب میں تھا۔ اگرچہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور ایک بچی بھی تھی۔ محمود کا قد چھوٹا تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ بال گھنٹے اور بھور کالئے تھے رنگ میلا میلا ساتھا بخنوں میں گھنٹی تھیں۔ پیشائی سے شدت کا اظہار ہوتا تھا۔ ہونٹوں میں شرارت دبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکتا اور بھوٹ سے شوٹی اور الحاد پیکتا اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ رومی لوپی جو وہ پہنتا تھا اور نماز میں جو وہ باقاعدہ پڑھتا تھا محض جھوٹ تھیں۔

محمود کے کردار کا سب سے بڑا جزو جذبہ اور اس کی شدت تھی۔ یہ جذبے گھری کے پنڈوں کی طرح مذہب اور عورت کے درمیان گردش کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں بے پناہ ذہانت تھی۔

محمود سے مراسم پیدا ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ ایلی کو جو مکان رہنے کے لئے ملا

وہ محمود کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ ابتداء میں ایلی نے محمود کے لئے کوئی جاذبیت
محسوں نہ کی تھی۔ غالباً نہ ہی ایلی اسے متاثر کر سکا تھا۔ چند ایک مرتبہ ان کی ملاقات
ہوئی پھر محمود نے آنا جانا شروع کر دیا۔ محمود کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو
ایلی کی کتابوں سے اور دوسرا نے اس کے مکان کے جغرافیہ سے۔ چونکہ اس کے
چوبارے سے محلے کے بیشتر مکانات دکھائی دیتے تھے۔ محمود کو عورتوں دیکھنے کا شوق
تھا اور عورتوں کے لئے اس کی شخصیت میں ایک انوکھی جاذبیت تھی۔ محمود کو دیکھ کر وہ
چڑھ جاتیں۔ انہیں یوں غصہ آنے لگتا جیسے انہیں چھیر دیا گیا ہو۔ پھر نہ جانے کس
اصول کے تحت وہ غصہ دغدھواروپ بدال لیتا اور عورات محمود کو ملنے کے لئے بڑی بے
با کی سے باہر نکل آتی۔

ایلی کو محمود کی اس خصوصیت کا نام تعلیم تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ان کے
میل ملاپ کی تمام توجہ انگریزی زبان تھی۔ اگر چہ وہ فقط میٹر یکو لیٹ تھا لیکن
نہایت اچھی انگریزی زبان تھی۔ اگر چہ وہ فقط میٹر یکو لیٹ تھا لیکن نہایت اچھی
انگریزی لکھتا تھا اور ایلی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ محمود کی نسائز؟ اس فوراً ڈوکشنری کو دو
مرتبہ یوں پڑھ چکا تھا جیسے ناول پڑھتے ہیں۔

چند ماہ دیپاپور رہنے کے بعد ایلی کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا جہاں صحرا کی جگہ
پہاڑوں نے لے لی اور تو دوں کے نیچے بیٹھنے کی بجائے وہ جیل اور دیواروں تلے
بیٹھ کر آہیں بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

دھرم سالہ سکول میں وہ اکیلا مسلمان ٹھپر تھا۔ چونکہ فارسی کا مولوی چند ایک ماہ
ملازمت کرنے کے بعد لمبی رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ
اسے احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس سے پہلے ایلی نے کبھی مذہب کے نقطہ نظر
سے زندگی کو نہ دیکھا تھا بلکہ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ سے قطعی طور پر کو را تھا۔
اگر چہ دویں جماعت میں اس نے کئی ایک ورزے رکھے تھے اور زندگی بھروہ عید کی

نماز پڑھنے جاتا رہا تھا۔

صرف علم ہی کی بات نہیں جذبے کے لحاظ سے بھی وہ مسلمان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب منصر نے اس کے روپ رواپنے اسلامی جذبے کی وضاحت کی تھی تو اسے بات سمجھ میں نہ آئی تھی اگرچہ بات کی تبلیغیت سے متاثر ہوا تھا۔

اس روز وہ دونوں سفید منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصر نے جذبہ اسلام کی بات کی تو ایلی کی فتنی تکلیفی۔ چونکہ منصر میں کوئی بات بھی اسلامی رنگ کی نہ تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ نمازوں میں پوست تھا۔ روزے نہیں رکھتا تھا اور رہاشق مزاج تھا۔

ایلی نے نظر منصر سے کہا۔
”اچھا تو آپ مسلمان ہیں؟“
”بالکل۔“ منصر جوش میں آ کر بولا۔ ”احمد اللہ میں مسلمان ہوں۔“
”سمجھ میں نہیں آتا۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ کیسے مسلمان ہیں؟“

”مُھریے۔“ منصر ایک سینئر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”دیکھئے اگر اس وقت چھت پھٹ جائے اور جبرائیل اتریں اور ہے باری تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ انصار منصر کو ہمارا سلام پہنچا دو اور کہو کہ اسلام جھونٹا مذہب ہے اور عیسائیت پی ہے۔ تو میں جبرائیل سے کہوں گا کہ باری تعالیٰ کو میرا سلام دو اور کہو حضور کا ارشادِ گرامی موصوہ ہوا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن انصاری منصر مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔“

ایلی اس نقطہ نظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ صرف ناواقف ہی نہیں اس لئے اس میں ایسے جذباتی نقطہ نظر کو سمجھنے کی الیت ہی نہ تھی۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں۔ اس کے برعکس جذباتی طور پر وہ مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی نقطہ نظر کا قائل ہونا چنی و سمعت کے فتقدان کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے وہ نمائشی طور پر مذہب سے بے تعلقی اور بے زاری کا

اظہار کرنے کا دلدار تھا۔ اور کفر والوں کی بات کرنے میں وچکی لیا کرتا تھا۔

رام دین

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ ایلی کو احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس روز وہ حسب معمول پڑھا رہا تھا۔ پڑھاتے ہوئے اس نے پیاس محسوس کی۔

”دینِ محمد“ وہ چلایا۔ چونکہ اس کی جماعت میں صرف ایک مسلمان لڑکا تھا جو اسے پانی لا کر دیا کرتا تھا۔

اس روز دینِ محمد حاضر نہ تھا۔

”رام لال۔“ وہ بولتا۔ مجھے ایک گائیں پانی لا دو۔

رام لال جوں کا توں اپنے ڈسک پر گھڑا رہا۔

”تم جانتے نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی ماشیر جی۔ میں پند و ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟۔“ ایلی ہٹنے لگا۔

”جی میں بھر شہرو جاؤں گا۔“

ایلی قہقہہ مار کر نہس پڑا۔ ”ویکھو رام لال۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو گے تو بے شک بھر شٹ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم مجھے پانی لا دو تو اس میں بھر شٹ ہونے کی کیا بات ہے؟“

اس پر بھی رام لال جوں کا توں کھڑا رہا۔

”جاونا۔“ ایلی کو غصہ آگیا۔

”جی میں بھر شٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ بولा۔

”اچھا تم جاؤ۔ مکنند۔“

مکن بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

ایلی کے دل میں ایک تھیس لگی۔ اس نے جماعت کی طرف دیکھا۔ سمجھی لڑ کے سر لٹکائے بیٹھے تھے۔

ایلی کی نگاہوں سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

”میں مسلمان ہوں۔“ نہ جانے کون اس کے دل میں چیخ رہا تھا۔

”الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔“ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جماعت سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز ایلی وہ رام دین کے چنور میں ڈبلکیاں کھارہا تھا کہڈا کیا آگیا اور اس نے ایک لفاف ایلی کے ہاتھ میں چھما دیا۔ لفاف پر غیر مانوس خط میں اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا خط ہے۔ پتے بھی تو کئی ایک لکھے ہوئے تھے۔ علی پور کا پتہ۔ خانپور کا پتہ اور دھرم سالہ کا سجا جامہ میریں لگی ہوئی تھیں۔

اس نے لفافہ کھولا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر سرخی میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تکھیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا
اے کچھ بھجہ میں نہ آیا۔ پھر دفتا اسے خیال آیا اور اس نے لفافے کی مہریں
پڑھنے کی کوشش کی۔ لفافے کی پشت صاف طور پر مہر لگی ہوئی تھی۔ گروہ کل مٹیث۔
”اے۔“ اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ خط کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

عجیب سی سیاہی تھی۔ نہ وہ سرخ تھی نہ شعر کے نیچے ایک دھبہ سا
پڑا تھا۔ دفتا اسے خیال آیا اور۔ خون۔ پھر اسے معلوم نہیں۔
وہ دھنڈ لگا۔ وہ خلا۔

وہ بھول گیا کہ وہ رام دین ہے۔ کمرے کی کارنس پر سادی کی مورتی رقص کرنے لگی۔ وہ رقص مسرت بھری حرکات سے عاری تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سیاہ لباس زیب تن تھا۔ نگاہوں میں حزن و ملاں تھا۔ نرت میں اواسی اور غم کوٹ کوٹ کر

بھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد ایلی کا خیال سادی پر مركوز ہو گیا۔ شہزادی صورت دھنڈلی پڑتی گئی۔ صدر کے قیقہے بے معنی ہوتے گئے:

”ٹھیک ہے۔ اگر وہ صدر کو چاہتی ہے تو ٹھیک ہے بلکہ اور بھی اچھا ہوا۔ جان چھٹی سو لاکھوں پانے۔“

سامنے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دھرم سالہ کے سرین پھاڑوں پر دوڑ رہی تھی۔ اسے بلا رہی تھی۔ ایلی نے سونگا اٹھایا۔ کندھے پر بیگ ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح اس نے دہ ملہ بسر کر دیتے۔ وہاں وہ صرف دو ماہ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ دو ماہ وہ پھاڑوں کی خاک چھوٹتا رہا۔ سادگی کے ساتھ وادیوں اور چوٹیوں پر گھومتا رہا۔

وہ اسے کہتا: ”نہیں نہیں سادی۔ میں نے تمہیں فراموش نہیں کیا۔ کیسے فراموش کر سکتا ہوں لیکن کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ کاش کے تم والد صاحب کی رضامندی کی شرط نہ لگا گئیں۔“

اور سادی جواب میں کہتی: ”میرا بس بھی تو نہیں چلتا۔ میں کیا کروں۔“ اور پھر وہ دونوں بانہہ میں بانہہ ڈال کر چل پڑتے جیسے اس مجبوری کو بھولنے کی کوشش میں سرگردان ہوں۔

ہیڈ ماسٹر

دھرم سالہ کے بعد اس کی تعیناتی جاورا میں ہو گئی اور وہ جاورا چلا آیا۔ جاورا لا ٹکپور کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کامرسہ نہایت فراخ اور خوبصورت تھا اور اس کے ساتھ بہت فراخ گراونڈ اور باغ اور پارک متحقیق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک کالج ہو۔

جب پہلے روز اس نے سکول کا بینڈ دیکھا جس میں گیارہ بیگ پاپ بنیں نج
رہی تھیں تو ایلی پرنٹر سا طاری ہو گیا۔

سب سے حیران کن چیز جو باور اسکول میں نظر آئی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس
نے کئی ایک سکولوں کے ہیڈ ماسٹر والی بھی تھا وہ سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے
ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر رسگی وقار اس قدر چھایا رہتا تھا۔ جیسے دور کا سفر کرنے
کے بعد جو تے پر غبار کی تباہ جنم جاتی ہے۔ غبار کی اس دیزیز تباہ کی وجہ سے ان کے
چہروں پر حس اور مردہ نظر آتے تھے۔ ان کی گرد نیس گویا ملکف ہوتیں جو بڑے
تکلف سے حرکت کرتیں۔ ہنکھیں نہ تو ہمدردی نہ انہساط کی چمک سے واقف
ہوتیں۔ وہ سیاحتی نہیں تھیں بلکہ کریدی تھیں۔ لکھتے چینی کرتیں۔ وہ سب پھونک
پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ایک مخصوص انداز سے کھانتے۔ ایلی انہیں دیکھ کر لرز جاتا
تھا۔ جھوٹے وقار کے حصول کے لئے وہ تکنی بڑی قیمت ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے
اپنے آپ پر زندگی حوا م کر رکھی تھی۔ اور وہ سب علم کی دولت سے کورے تھے چونکہ
ان میں طلب علم نہ تھی۔ طلب کیسے ہوتی جبکہ انہیں کامل یقین تھا کہ وہ جانتے ہیں۔
ان کے دلوں میں یہ شبہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ جانتے ہیں شاید غلط ہو۔ شاید اس
میں ترمیم کی ضرورت ہو۔ وقت کے تقاضے کے مطابق رو و بدل کی ضرورت ہو۔
انہیں دیکھ کر ایلی کے دل پر خوف مسلط ہو جاتا تھا۔ کہ ایک روز وہ بھی بیڈ ماسٹر بن جا
ئے گا۔ ہاتھ میں چھڑی تھام لے گا۔ انکھوں سے دیکھنا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دے
گا اور پھوٹ کے دل میں ولی ہی نفرت و حقارت پیدا کر لے گا۔

جاور اسکول کا ہیڈ ماسٹر قطعی طور پر مختلف تھا اور یہ امر ایلی کے لئے باعث تعجب
اور سرست تھا۔ اس کا نام شیخ مسعود تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ جسم گٹھا ہوا۔
کلینیشن شیو۔ انکھوں میں جستجو اور چمک اور انداز میں ہیڈ ماسٹریت نام کون تھی۔

”ایئے ۲ صفحی صاحب“ وہ ایلی کو دیکھ کر چلایا۔ تو آپ ہیں ہمارے نئے

لیچپر۔ اگر آپ تعیناتی کا خط نہ دیتے مجھے کچھ دیر اور تو میں کہنے ہی والا تھا کہ آپ کون سی جماعت میں داخل چاہتے ہیں۔ ”اس نے بھر پور قہقہہ لگایا۔ ”اب آپ ہی بتائیے ۱۰ صفحی صاحب۔ اگر سکول میں ایسے اسامیہ آجائیں تو کس قدر مشکل ہو جاتی ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ استاد کون ہے اور سعیدونٹ کون؟ خیر خیر مگر ایک بات ہے۔ آپس کی بات ہے میں کسی سے کہوں گا نہیں۔ یہ بتائیے کہ جماعت کو سنبھال بھی لیں گے۔ ”شیخ مسعود نے پھر قہقہہ لگایا اور پھر ایلی کی گہراہٹ کو بھج کر فوراً بات بدی۔ ”چلے وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا کیوں نہ کھالیں۔ کہتے ہیں پہلے طعام پھر کلام۔ آئیے گھر سے میرا کھانا آیا ہو اسے اور قوم مقدار میں اتنا ہوتا ہے کہ دو شخص پہٹ بھر کر کھائیں پھر بھی بخچ جاتا ہے۔“

شیخ مسعود با تین کرتے ہوئے آگے آگے جا رہے تھے۔ ایلی ان کے پیچے پیچے چل رہا تھا۔

”لیکن ایک بات ہے۔“ وہ ڈھکے ہوئے دستر خوان کے قریب جا کر کہنے لگے۔ ”شرط لگالو۔ اگر میری بیوی نے آج وال کے علاوہ کچھ بھیجا ہو۔ خدا کی قسم۔ بیگم ولی اللہ سے کم نہیں۔ جب مہمان آنا ہو سو فیصدی وال پکاتی ہے۔“

یہ کہہ کر شیخ نے دستر خوان ہٹا دیا اور برتن کو دیکھ کر بے تحاشہ قہقہہ لگایا:

”لو دیکھو ۱۰ صفحی صاحب۔ میں نے کہا نہ تھا۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ تھقہ پر قہقہہ مارنے لگے۔

شیخ مسعود ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی طبیعت بیک وقت رسمی اور غیر رسمی تھی۔ کبھی وہ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہننے مدرسے میں آ جاتا اور انگریزی بولنا شروع کر دیتا۔ کبھی کمبل لپیٹے آوارد ہوتا اور وہ قانون کی طرح با تین کرتا۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا اور وہ اسکیلے بیٹھنے سے بے حد خالف تھا جیسے اسے خود سے ڈر لگتا ہو۔ فتر میں بھی اکیلانہ بیٹھتا بلکہ اسامیہ کو بلا کراپنے گرد ایک بھیڑ لگا لیتا اور پھر ان سے بے

تکلف دوستانہ باتیں کرتا۔ ان کے روپ و گالیاں دیتا۔ تحقیقہ لگاتا۔ گالی دینا اس کی عادت تھی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ غصے میں گالی دے رہا ہے بے تکلفی کے اظہار کے لئے یا ویسے ہی عادت پوری کرنے کے لئے۔ نہ جانے کس اصول کے تحت تحقیقہ مارتے مارتے ~~دلتا وہ غصے میں آ جاتا اور پھر منظر ہی بدلتا جاتا۔~~ حام طور سے وہ بے تکلف ~~گفتلوں~~ کے دوران میں اپنی طبیعت کی ستم ظریفی کے متعلق باتیں کرنے کا عادی تھا۔

”میں وہ ~~شخص ہوں۔ وہ گالی دے کر کہتا۔~~ جو لوگ کی طرح اولتا بدلتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ آج تک اپنی طبیعت کا جنت منتر سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ ہو تو یقین نہ سمجھے کہ نہیں رہا ہوں۔ اور غصہ غصہ اُں حد تک آتا ہے مجھے اور اس قدر آنا فانا کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بندوق خریدی تھی کہ چور چکار سے محفوظ رہوں لیکن اسے کھول کر اس کے کل پر زے الگ الگ صندوقوں میں بند کر رکھے ہیں کہ جب تک انہیں آکھا کر کے جوڑوں تک شاید غصہ اتر جائے اور نہ بھی اترے تو بیگم دہائی تو مچا سکے۔“

اس کی باتیں بے جوڑ ہوتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کوئی نہ کوئی خیال آ جاتا اور وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور اس خیال کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا۔

اس عجیب و غریب طبیعت کے باوجود ایلی کو شیخ مسعود بے حد پسند آیا لیکن وقت یہ تھی کہ شیخ مسعود ایلی کو کسی وقت بھی تو اکیلانہ رہنے دیتا تھا۔ سکول بند ہوتا تھا تو وہ اسے بلا لیتا:

”چلو آصفی صاحب۔ تمہیں شہر دکھا لاوں۔ بڑے بڑے دلچسپ لوگ ہیں یہاں۔“

”وہ دونوں شہر کی طرف چل پڑتے راستے میں شیخ گپیں ہا نگتا جاتا اور ہراتے جاتے سے ملتا اور بے تکلفی سے باتیں کرتا۔

ارے۔ چلتے چلتے وہ چونکتا۔ آج بدھ ہے نا۔ آج تو مجھے چک بیس جانا ہے۔ تا
نگے والے۔ شورچا دیتا اور پھر زبردست ایلی کوتانے میں سوار کر کے وہ چک بیس
کو چلے جاتے ہیں۔

شام کو جب وہ لوٹتے تو وہ زبردست ایلی کو پکڑ لیتا:

”اب کھانا کھائے بغیر جانے نادوں گا۔“

کھانا کھانے کے بعد وہ کوئی قصہ چھیڑ لیتا اور ایلی سوچتا کہ کب بات ختم ہوا اور
وہ اجازت حاصل کر رئے۔ طبعی طور پر ایلی ایک تہائی بے حد ہے سو سالگی میں بیٹھ کر وہ جاتا تھا اور بات بھی
کر لیتا تھا لیکن اسے سو سالگی میں بیٹھ کر سکون یا انکوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس کے بر
عکس اس پر ایک ضرب چھائے رہتا۔

اس کے علاوہ سادی اس کی منتظر رہتی تھی کہ کب اسے تہائی حاصل ہوا اور وہ
دونوں بیٹھ کر باقی کریں۔

صرف اس وجہ سے ایلی چند ایک روز ہی میں شیخ مسعود کی مصاہبت سے آتا گیا
لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ زبردستی اپنے آپ کو الگ کر سکے۔ بہانے تو وہ بنا تا
تھا یا چوری چوری سرک جانے کی کوشش کرتا سب کوششیں بے کار ہو جاتیں چونکہ شیخ
مسعود اسے ڈھونڈ نکالتا اور پھر شیخ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

ساتھی

جاورا میں ایلی نے صرف چند ایک ساتھی بنائے اور وہ سب متفقہ طور پر شیخ کے
متعلق اچھی رائے نہیں نہیں رکھتے تھے۔ سکول کے اساتذہ بھی جہاں تک ممکن تھا اس
سے دور رہنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ اس
کے خلاف کیوں تھے حالانکہ شیخ کی شخصیت کے کئی ایک روشن پہلو تھے۔ ممکن ہے وہ
ایک تاریکی بھی ہوں۔ تاریک پہلو کس میں نہیں ہوتے۔

جاورا میں سکول کے قریب ہی ایلی اور افضل نے مل کر ایک مکان لے رکھا تھا اور کام کاج کے لئے ایک نو کر رکھ لیا تھا۔ افضل ڈاکنے کا ایک ٹکر کھا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا قد آور نوجوان تھا۔ مسلسل فکر کی وجہ سے اس کا چہرہ لمبا ہو چکا تھا۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن آنکھوں میں غم یا درپیشانی کے بجائے شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تضادی بارا ایلی کو چونکا دیتا۔

افضل نکلا اور چپ چاپ بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوتا تو اضطراب کی وجہ سے اس کا یاپوں یا نانگ مسلسل حرکت کرتا جیسے مضطرب ہو۔ چہرے پر سوچ بچار اور فکر کے آثار چھائے رہتے اور وہ کوئی شعر لگانے رہتا۔ اسے اچھے شعروں سے والہانہ عشق تھا اور اسے سینکڑوں اچھے شعرياء تھے۔

ایلی اسے پوچھتا:

”یار یہ کیا ماجرہ ہے؟ پیشانی سے تم فکر کرتے ہو۔ نانگیں اضطراب میں جاتر نگ بھاتی ہیں۔ ہونٹوں پر گیت رہتا ہے اور آنکھیں نت نئی شرارت سے چمکتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“

افضل مسکرا دیتا: ”بس دیکھ لو۔ جو موجود ہے حاضر ہے اور جو حاضر ہے اس میں جدت کیسی؟“

پھر ان کا پڑو سی شبیر تھا۔ شبیر سکول میں عربی اور فارسی پڑھانے اور چھوٹی سی دارالحکمی رکھنے کے باوجود مولوی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر محبو بیت کی جھلک نمایاں تھی۔ نگاہوں میں شوٹی تھی۔

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فرانس یا اٹلی کا باشندہ ہو۔ شبیر کی زندگی بیوی کے مرکز کے گرد گھومتی تھی بلکہ یوں کہتے کہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ اس مرکز کے گرد گھومے۔ ممکن ہے اسے بھی اس مرکز سے کچھ لگاؤ ہو لیکن بظاہر سے کچھ لگاؤ ہو لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک بچہ ہو اور گھروالی اس کی دیکھے بھال کرنا اپنا

فرض بھجتی ہو۔ وقت پر اسے کھانا کھلاتی۔ وقت پر بستر پر لٹا کر سونے پر مجبور کر دیتی۔ مناسب لوگوں سے ملنے کی اجازت دیتی اور وہ بھی فقط مناسب وقت کے لئے۔

صرف ایسی جگہ جانے کی اجازت دیتی جہاں اس کے اخلاق پر براثر نہ پڑے۔

ایلی کو پہلے پہل اس کا احساس اس روز ہوا جب وہ شیر سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے باقیں کرتے رہے۔ پھر فتح اندر سے کسی نے چلا کر شیر کو پکارا۔

”کون ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بیگم بیاری ہے۔“ شیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تو جا کر سن آؤ اس کی بیانات۔“

”پھر کہی۔“ وہ بولا۔ ”پاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“ وہ پھر باتوں میں معروف ہو گئے۔

”دھڑوڑرڑرڑرام۔“ قریب ہی ایک دھماکہ ہوا۔

”اے۔“ ایلی ڈر کر اچھلا۔ ”یہ کیا تھا؟“

شیر کا منہ زرد ہو رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ زیر لب بولا۔ ”بیگم نے پتھر کی سل دروازے پر دے ماری

ہے۔“

”اے۔“ ایلی چلایا۔ ”تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے روزمرہ کی بات ہو۔“

”ہاں۔“ شیر نے اثبات میں اشارہ کیا۔ ”ہے۔“

”بیگم ہے یا پہلوان ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”دھرم۔“ دروازے پر پتھر سل پڑی۔

ایلی اٹھ پیٹا۔ ”میں جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”میرے شانوں پر تو صرف ایک ہی

سر ہے یا ر۔“

اس کے بعد ایلی نے دیکھا کہ جب بھی شبیران کے ہاں آتا تو یوں دبے پاؤں داخل ہوتا جیسے چور ہو۔ فرائی آہٹ پر گھبرا جاتا۔

پھر ایک روز تو بالکل ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔

ابھی شبیر کو آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ گلی کا ایک اڑکا آیا۔

”شبیر صاحب کو گھر بلاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

ایلی جواب میں سمجھ کہنے ہی والا تھا کہ شبیر پھدک کر کونے میں جا چھپا اور اشارے سے ایلی کو کہنے لگا کہ کہہ دشیر بیہاں نہیں آیا۔ لڑکے کے جانے کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھ گیا اور دیوار پھلانگ کر ڈرائیٹ ماسٹر کے گھر چلا گیا جس کے مکان کا دروازہ پر لی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی شق کے پیچھے کھڑی ایلی کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے دوسری گلی سے گھوم کر گھر چلا گیا تاکہ بیگم یہ سمجھے کھڑی ایلی کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے دوسری گلی سے گھوم کر گھر چلا گیا تاکہ بیگم یہ سمجھے کہ کسی اور جانب سے آیا ہے۔ اس روز ایلی کو اندازہ ہوا کہ وہ فرانسیسی مولوی واقعی سکول کا بچہ ہو جو گھر سے چوری چوری آوارہ گردی کرنے کا عادی ہے۔

پھر ان کا پڑوسی ڈرائیٹ ماسٹر جو طبعاً لا ہو رکا بھاء ما جھا تھا۔

اور وہ الگاش ماسٹر احمد تھا جو کلاس میں اوپنگنے کا عادی تھا۔

اور جب محفل میں کوئی دلچسپ بات ہو رہی ہوتی تو اس کے دوران سو جایا کرتا تھا اور آخر ش اڑ چو دھری تھا۔

چو دھری کی بولٹ بولٹ تھر کتی تھی۔ اس کی بات میں دھار تھی اور نگاہوں کی مسکراہٹ پیچی کی طرح کاٹ دیتی تھی۔ سمجھی بات میں الجھاؤ ڈالنا۔ دوسروں کو بنانا اور سنجیدہ ترین مسئلے کو پُنسی میں ٹال دینا اس کے باعث میں ہاتھ کا کرتب تھا۔

ایلی کے یہ ساتھی اس کے شیخ کے ساتھ زیادہ میل ملا پ رکھنے کے حق میں نہ

تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ مسعود قابل اعتماد آدمی نہیں۔ ایلی سمجھتا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کے اندازے درست نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان سب کی خواہش تھا کہ مل بیٹھیں۔ گپیں ہانگمیں ستائش کھیلیں یا گھو میں پھریں۔ شاید اس لئے وہ ایلی کے شیخ سے زیادہ میل جوں رکھنے کے خلاف تھے۔

جاور اسکول میں آتے ہی ایلی کی حیثیت شیخ کے مصاحب کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کا مشیر نہ بن سکتا تھا چونکہ شیخ اپنی مرنسی کا مالک تھا اور کسی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایلی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے کسی کا مشیر نہ بن سکتا تھا۔

اسکول سے فارغ ہو کر شیخ ایلی کو اپنے کھر لے جاتا۔ کہاں کہا کروہ ایلی سے کہتا: ”دو ایک خط لکھوں تو کیا ہرج ہے۔“

اور پھر اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنا شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی قہقہہ مار کر ہوتا:

”بھی آصفی! معلوم ہے میں دروازے کیوں بند کر رہا ہوں۔ جو نبی مجھے خط لکھنے کا خیال آیا تو ساتھ ہی بے سوچے سمجھے میں نے دروازے بند کرنے شروع کر دیتے تا کہ خط لکھواؤں تو کوئی سن نہ لے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔

”تو کیا کافی ڈنسل خط لکھوانے ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو،“ وہ ہنسنے لگا۔ ”عام سرکاری خط ہیں لیکن میرے لئے ہر خط کافی ڈنسل ہے۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا میری دشمن ہے۔ سب میرا بھید جانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ رات کو جب میں کمرے میں سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کھڑ سے مجھے پروا رکیا جا سکتا ہے۔ کھڑکیاں کھول کر نہیں سوتا چاہے کتنی گرمی ہو۔ چونکہ مجھے خیال آتا ہے کہ کوئی کھڑکی سے پستول چلانے گا اور خود بھاگ جائے گا۔“ شیخ مسعود ہنسنے لگا۔ ”میری طبیعت ہی ایسی

ہے۔"

اس قسم کی باتیں سن کر ایلی کو شیخ پر ترس آتا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی۔ اس حد تک شکی اور بد اعتماد شخص پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا! وہ سوچتا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایلی کی طبیعت میں شیخ کے لئے نفرت پیدا ہو گئی اور شیخ ایلی پر ٹنک کرنے لگا اور جاورا میں ایلی کی زندگی کا دھار اکسی اور رخ پر بننے لگا۔

پاگل مولوی

نہ جانے ایک روز بیٹھے بھائے شیخ کو کیا سوچھی ایلی سے ہے لگا:
”اصفی۔“ اور تمہیں تناشد و لطا میں 2002ء

شیخ اسے دفتر میں لے گیا۔ پھر اس نے مولوی رحمت اللہ عربی مastr کو بلا بھیجا۔ پہلے تو عربی ماstr سے اس نے چند ایک سوال کئے پھر جوش میں آ کر انہیں ڈالنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔

جیسے پاناخ کو آگ دکھاوی گئی ہو شیخ مسعود نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ غلیظ نگنی گالیاں۔

اس پر عربی ماstr کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان سے مہمل آوازوں کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔ ظاہر تھا کہ شدت و غصہ اور بے بسی کی وجہ سے مولوی صاحب کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں ان کی حالت غیر ہوتی توں توں شیخ کا جوش بڑھتا۔

آخر مولوی صاحب کے لئے حالات ناقابل برداشت ہو گئے۔ ناقابل برداشت تو ہو پہلے ہی تھے لیکن مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ مزید بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ دروازے کے باہر ساتھ اور طلبہ کی بھیڑ

لگی ہے تو انہیں مزید بے عزتی کا احساس ہوا اور اس قدر صدمہ ہوا کہ بے ہوش ہو کر
گر پڑے۔

مولوی رحمت اللہ جاورا کے ایک معزز شخص تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند
تھے۔ اکثر جمعہ کے روز جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے۔ کم گوتھے اور مرے کا کام بڑی
محنت سے کرتے تھے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے غصے میں ڈوڑھن ٹل آپنے کو ایک پارائیٹ خط
لکھ دیا جس میں انہوں نے اسی واقعہ پر ایلی بھی بھونچ کارہ گیا۔ کیا یہ تماشہ تھا؟ کیا یہ
بات شیخ کے لیے مذاق کی دینیت رکھتی تھی؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسے سوچ بچار میں کھوئے دیکھ لر شیخ بھی تاذگیا کہ ضرر مولوی کے واقعے نے
اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ یہ محسوس کر کے شیخ نے ایلی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے
مولوی صاحب کا تذکرہ شروع کر دیا۔

”یہ مولوی لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔“ وہ بولا۔ ”انسان اتنا بھی مسئلے مسائل
میں نہ کھو جائے کہ اسے یہ تمیز ہی نہ رہے کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مولوی خود
تو بے حد شریف اور بے زبان ہے لیکن اس کی بیوی اس کی شرافت اور بے زبانی کا
خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔“ شیخ نے قہقهہ مارا۔ ادھیر عمر کی عورت خود کیا فائدہ
حاصل کرے گی لیکن اس کی بیٹیاں جو _____ ”شیخ نے ایلی کو آنکھ ماری اور پھر
قہقہہ مار کر رہنے لگا۔

ایلی کو اس کی بنسی بری لگی لیکن اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ اعلانیہ احتجاج
کرتا۔ بہر حال اس شام ایلی گھٹا گھٹا رہا اور شیخ ہر ممکن طریقے سے دلچسپ اور مزاجیہ
باتیں سن کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب ایلی گھر پہنچا تو وہاں تمام ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب
غصے میں تھے۔ ایلی پر وہ یوں برس پڑے جیسے مولوی کی بے عزتی اسی کی وجہ سے ہوئی

ہو۔ افضل غصے سے کانپ رہا تھا شیر کارنگ زردو ہورہا تھا اور اس روز وہ بھول گیا کہ اس کی بیوی دیکھ رہی تھی کہ وہ ایلی کے مکان میں بیٹھا ہے۔ سمیع شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ احمد سر جھکائے بیٹھا تھا اور چودھری مسکرا کر کہہ رہا تھا: ”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تمام شرارت الیاسِ آصفی کی ہے۔“

پانچ چھوڑ کے بعد ڈویشن اسپکٹر سے دو خط موصول ہوئے۔ ایک تو شیخ کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ جواب دے کہ اس نے ایسا سلوک مولوی سے کیوں روار کھا اور دوسرا خط ہید ماسٹر کے قمرط سے مولوی صاحب کے نام تھا جس میں ان سے اس امر کی جواب طلبی کی تھی اُبھوں نے پر اہ راست اسپکٹر کو خط کیوں لکھا۔

شیخ نے اپنے نام کے خط کے متعلق تو کسی سے مذکورہ نہ کیا لیکن مولوی صاحب کے خط کی اس قدر تشریف کی کہ پچھے پچھے علم ہو گیا کہ اسپکٹر نیت اُن مولوی صاحب کو ڈانگا ہے۔

اس روز رات کو شیخ ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا:

”بھائی آصفی۔ میں سمجھتا ہوں مولوی صاحب سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک تو اس روز میں نے انہیں بلا وجہ برآ بھلا کہا حالانکہ وہ محض مذاق تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہا چاہیے تھا اور اب اسپکٹر نے اس سے جواب طلبی کی ہے۔ بے چارہ پٹ جائے گا۔“
ایلی کو موقع مل گیا۔ بولا: ”ہاں آپ نے واقعی مولوی صاحب سے زیادتی کی تھی۔“

”تو اب کسی طرح اس کا مدارک کریں۔“ شیخ نے نہ کر پوچھا۔

”کریں تو بہتر ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو میں معافی مانگ لوں۔“ شیخ چلا یا۔

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ کاغذ اپنے ہاتھ سے لکھے

دے کہ میں نے صدق دل سے معاف کر دیا۔“

شیخ کی ۹ یہ بات سن کر ایسی کے دل میں پھر سے اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد مسلسل دو روز سارا شاف مولوی صاحب کی منتیں کرنے میں لگا رہا تھا لیکن کہ شیخ کو معاف کرو یا اور تحریر لکھ کر دیا یا مولوی صاحب اس پر آمادہ نہ تھے لیکن آخر کار انہوں نے مولوی صاحب کو مجبور کر دیا اور انہوں نے یہ تحریر لکھ دی کہ اگرچہ شیخ کا طرز عمل ناروا تھا تاہم ان کا راضی نامہ ہو گیا ہے اور انہوں نے شیخ کو معاف کر دیا ہے۔

یہ تحریر حاصل کرنے کے بعد شیخ نے سلوک بند ہونے پر مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بلا یا جب بہ اساتذہ اور طالبہ جاتا چکے تھے اور پھر سے انہیں لا تعداد نہش گالیاں دیں اور جان بو جھ کر ایسے سخت کلمات کہے کہ وہ پھر غصے میں آ کر انسپکٹر کو شکایت کریں۔ شیخ کا یہ اقدام سوچ سمجھے پان کے مطابق تھا۔ بلکہ ایک چیڑ اسی کو آگ لگانے کے لئے ان کے گھر بیجا۔ چیڑ اسی نے مولوی صاحب کو بتایا کہ انسپکٹر نے شیخ کی بھی جواب طلبی کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب شیخ کے خلاف شاکیت کا ایک اور خط لکھیں۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب نے دوسرا خط لکھ دیا ہے تو شیخ نے انسپکٹر کو اپنی طرف سے خط لکھا جس کا نفس مضمون یہ تھا:

”مولوی رحمت اللہ میرے باپ کی جگہ ہیں ان کی عزت کرتا ہوں۔

عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ اونٹ سے سر کے بل گر پڑے تھے۔ ان کے سر پر چوٹ آئی تھی جب سے ان کا ذہن کا توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی

بے وجہ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی مجھے معاف کر دیتے ہیں۔

غالباً وہ جاورا میں رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ خانگی امور ہیں۔ بہر حال میں نہیں چاہتا کہ ان کی بہتری میں حاصل ہوں۔ مولوی صاحب کا معافی نامہ

ارسال خدمت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے عاف کر دیا۔
اگرچہ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ سہواً کوئی بات منہ سے نکل گئی
ہو جسے غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے برآمد لیا ہو تو مجھے علم نہیں۔“

ایم معروف ولایت سے پیر شرائی کی فاگری لے کر نئے نئے ہندوستان میں
آئے تھے اور آتے ہی کاج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر چند ماہ کے بعد مکملہ میں
ڈویژن اسپاٹر کے عنہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہا یے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے
اور چونکہ طبع پر کسی کا جو انہیں چاہتے تھے الہڑا شیخ مسعود کے اس خط سے جو مولوی
رحمت اللہ کے دوسرے شکایتی خط کے ساتھ موصول ہوا تھا انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی
مولوی صاحب کا ذہنی تو ازانِ ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کے لئے بے انتہا
ہمدردی محسوس کی۔ اپنے ڈپٹیوں کو بلا کر انہیں ساری بات سمجھائی کہ وہ دور دورے پر
جائیں تو کوئی مناسب مقام تلاش کریں جہاں مولوی صاحب کو تبدیل کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی ڈپٹی یا معروف جاتے کمال ہمدردی سے کہتے:

”ہمارے ایک عربی مولی ہیں جو بڑے معزز اور شریف آدمی ہیں البتہ ذرا ذہنی
تو ازانِ ٹھیک نہیں ان کا۔ اگر آپ انہیں اپنے مسکول میں لے لیں تو کیا اچھا ہو۔“

افسانہ کی اس بے پناہ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی دیواری پر مہر
ثابت ہو گئی اور ڈویژن کے کوئے کوئے میں مولوی صاحب کے دماغی عارضے کا
پر چار ہو گیا۔ ادھر شیخ مسعود نے اسے ہوادی۔

مولوی صاحب کی بیگم کے کانوں تک بات پہنچی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ کہنے لگی:
”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ باو والا ہے کوئی مانتا ہی نہ تھا۔“

یہ بات ان کی بیوی کے حق میں تھی چونکہ وہ مولوی صاحب سے الگ آزادی
میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے بہانہ مل گیا۔ ایک روز دفعتاً اس نے شور مچا دیا جب مولوی
صاحب وظیفہ پڑھنے میں معروف تھے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس پر بیگم نے پینترا

”دہائی خدا کی اب لوگوں کو دکھانے کے لئے جائے نماز پر جا بیٹھا ہے۔“

یہ تو بہر صورت تمہید تھی۔ بیگم نے محلے کے چار بزرگوں کو بٹھا کر کہا کہ میں تو ہرگز اس دیوانے کے ساتھ نہ رہوں گی۔ اور یہ فیصلہ کرا لیا کہ وہ لپکپور رہے اور مولوی صاحب انہیں باقاعدہ خرچ بھیجتے رہیں۔ اس نیلے یک بعد وہ بچپوں کو لے کر چل گئی اور مولوی صاحب تنہارہ گئے۔

حالات کو پیوں بدلتے دیکھ کر مولوی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیٹھے بٹھائے چاروں طرف آگئی کیوں لگ گئی ہے۔ کیوں لوگ انہیں پا گل سمجھنے لگے ہیں۔ حیرت اور گھبرائی سے ان کی شکل و صورت میں دیواں کی جھلک پیدا ہو گئی۔

شیخ مسعود واحد آدمی تھا جو حالات کے رخ کو سمجھ رہا تھا مولوی صاحب کا ذکر آ جاتا تو وہ تحقیقہ لگاتا اور خوش ہوتا جیسے کسان اپنی بولی ہوئی فصل کا ٹھیک وقت خوشی سے پھولانہیں ساتا۔ شیخ اپنی اس کارروگی پر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی اس صنائی میں مزید بیل بوئے کاڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے اپنے ایک سکھ شاگرد سو بھانگھ کو جو سکھوں کے ایک چک میں مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر بن چکا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے مسکول میں لے لینے کی پیش کش کر دے اور بعد میں ذرا ان کے مزاج صاف کرنے کا انتظام کرے۔

انسپکٹر صاحب کو بھلا بات کی حقیقت سمجھنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو صرف نظم و نسق چلانے پر مامور تھے انہوں نے سکھ ہیڈ ماسٹر کے اس اقدام کی تعریف کی اور مولوی رحمت اللہ وہاں تبدیل کر دیئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سو بھانگھ کے تو سط سے مولانا کو چک میں کوٹھری مل گئی۔ اروہ وہاں کسپری کے عالم میں جا پڑے سو بھانگھ نے پہلے ہی

چک میں مشہور کر دیا کہ ان کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔

ایک روز مولانا نے جوش اسلام میں آ کر بنا آواز بلند آذان فرمادی۔ سو بھائیوں کا اشارہ تو پہلے ہی موجود تھا۔ لوگ مولوی صاحب پر پل پڑے۔ انہوں نے پیٹ پیٹ کر انہیں اوہ موا کر دیا اور کوڑھنی سے ان کا سامان نکال کر باہر پھکنوا دیا۔ سامان کیا تھا۔ ایک بستر ایک لفڑا ایک جائے نماز اور ایک تسبیح۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ چک سے دلیں نکالا ملنے کے بعد مولوی صاحب نے عالم مجبور میں علاقے کی اس واحد مسجد میں قیام کیا جو وہاں سے چار میل در بر سر اورہ مسافروں کے نماز پڑھنے کے لئے بنائی تھی اور جو چار مربع فٹ ایکٹوں کے چیوتے پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں صرف وہی پناہ گاہ انہیں مل سکی۔ انہوں نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا اور خود اللہ کی یاد میں بیٹھ گئے۔ پھر ایک روز ز سو بھائیوں کے اشارے پر کوئی ان کا بستر اٹھا کر لے گیا۔ جب وہ مسکول سے واپس آئے تو بستر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ رات کو سردی کی وجہ سے وہ اکٹھ گئے اور اگلے روز مسکول میں لٹکے ان کے گرد جگھا کئے انہیں چھیڑ رہے تھے۔

”پا گل پا گل۔“

پھر معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا۔ زمین نگل گئی یا آسمان نے ڈھانپ لیا۔

سازشی

مولوی صاحب کے اس المیہ پر ایلی ششد رہ گیا۔ ملازمت کی دنیا سے متعلق یہ پہلی جھلک تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ ملازمت میں سازش کا کا یہ پہلا تجربہ تھا آج تک وہ زندگی کو گویا کنارے پر بیٹھ کر دیکھا رہا تھا۔ اس کے روپ و منظر ماذل مسکول کا ٹھیچ پھڑا چھڑی ہلا رہا تھا۔

”بھول جاؤ۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے سب بھول جاؤ۔ کتابوں کی دنیا کو فراموش کر دو۔“ وہ چھڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ ”یہ لوایے استعمال کرنے میں درخخ کیا تو پٹ جاؤ گے۔“

دوسرا طرف شیخ مسعود قہقہہ مار کر نہس رہا تھا:

”دیکھا کیسا تماشہ دیکھا یا تمہیں۔ بیوقوف کہیں کا۔ میری شکایت کرتا ہے۔“

میری۔ بکری کا بچہ جنگلی سور سے کھلنا چاہتا ہے۔ بے وقوف دیوانہ۔“

ایک طرف مولوی خود کھڑا رہا تھا۔ اس کا چہرا بھی انکھیں تھیں۔ ہونٹ سوچے ہوئے تھے۔ ”یا اللہ“ وہ بڑا اور رہا تھا۔ ”یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یا اللہ۔“ ایلی دانت نہیں کر سکا۔ ”یہ تیری دنیا ہے کیا۔“
الله تعالیٰ کے خلاف اسے ایک اور شکایت اپیدا ہو گئی اس زمانے میں وہ اس مشہور شعر کا قائل تھا۔ انسان پر ایک اور علم۔ اللہ تعالیٰ کی ایک اور تو ہیں۔

”سور۔ سور۔ جنگلی سور۔“ ایلی کے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں۔

گھر میں اس کے تمام ساتھی غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔“

”اب ہمارے ہاتھ سے فتح کرنہ جائے۔“ فضل کی ٹانگ مل رہی تھیں۔
انکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”وہ چال چلو۔“ چودھری مسکرا رہا تھا۔ ”کہ زندگی بھر شیخ کو معلوم نہ ہو کہ کون
چال چل گیا۔ بس چاروں شانے چت گرا ہو۔“

اس رات دریتک ایلی کے مکان پر کافر نس ہوتی رہی۔ طے پایا کہ فوری اقدام
کیا جائے مگر شیخ کو علم نہ ہو کہ وارکہ دھر سے ہو رہا ہے ورنہ اگر وہ خبردار ہو گیا تو حملہ
کرے گا اور اس میں حملہ کرنے کی عظیم صلاحیت ہے۔ جا ورے کے تمام لوگ مل کر
بھی اعلانیہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

حملہ کی تمام تفصیلات کو طے کرنا ایلی کے ذمے کر دیا گیا۔

اس کے بعد ایلی اور فضل کا گھر سازش کے اٹے میں بدل گیا۔ فضل کی
انکھوں میں پھل بھڑیاں چلنے لگیں جیسے بیخ تلاab میں آپنچی ہو۔ چودھری کے گال ابھر

کر گلابی ہو گئے۔ احمد کے خوابیداہ خدو خال میں ہلکی سی بیداری پیدا ہو گئی۔ شبیر میں خارجی دنیا میں اس حد تک پھیپھی پیدا ہوئی کوہ بیوی کو بھول گیا۔ اور مسلسل گھر سے باہر وقت گزارنے لگا۔

ایلی کا مکان چونکہ گلی کی نکڑپی واقع تھا اس لئے آمبیلی ہاں بن گیا۔ وہاں بحث مبارکہ ہونے لگی۔ قبر اردار میں پیش ہونے لگیں۔ پلان بننے لگے۔ تفصیلات طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب وہ سرگرم بحث تھے تو دروازہ بجا اور شبیر داخل ہوا:

”کچھ ہوش بھی ہے؟“ بولا۔

”اب ہم ہوش و حواس کی دنیا سے نکل آئتے ہیں۔“ ”فضل نے جواب دیا۔“
”بس اب تو ایک وہمن سوار ہے، یہ وہری نے اپنی رذانہ آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہوں۔ یہ غلط بات ہے۔“ شبیر بولا۔ ”اگر بات نکل گئی تو سازش وہری کی وہری رہ جائے گی۔ و نکل شروع ہو جائے گا۔“

”نہ بھی۔“ جمال بولا۔ ”ہم تو سازش تاکل ہیں، و نکل کے نہیں۔“

”و نکل تو ان پڑھا اور غیر مہذب آدمیوں کا کام ہے۔“

”ہے نا۔“ شبیر نے رازدارانہ طور پر کہا۔ ”تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سازشیوں کا یہ گروہ ابھی خام ہے۔“

”ہماری تو ہین کرتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ہم جو پیدا اُٹھی کیا خاندانی طور پر مانتے ہوئے سازشی ہیں۔“

”تو خاندانی سازشی کو معلوم ہونا چاہئے ابھی آدھے گھنٹہ ہوا۔ آپ کے دروازے پر خود شیخ مسعود کھڑا تھا اور وہ یہاں پورے پانچ منٹ کھڑا رہا۔“

”اے۔“ سب کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر محفل پر سانا چھا گیا۔

”ابھی تو شیخ پر وار نہیں وہا اور وہ مطمئن ہے اس کے باوجود وہ اس قدر شکی مزاج

واقع ہوا ہے کہ فضا کہ سو گھنٹے سے نہیں چوتا۔ جب وار ہو جائے گا پھر تو وہ ساری ساری رات بستی کے چکر کا ٹے گا جیسے مسلمان باڈشاہ بھیں بدل کر رعايا کا حال جانے کے لئے گھوما کرتے تھے۔

”بھی یہ تو ٹھیک ہے۔“ فضل بولا۔
”اور اس کھر میں جوبات ہوتی ہے وہ آدمی گلی تک سنائی دیتی ہے۔“

اس کا تیجہ یہ ہوا کہ چند کر کے ایک پرانا ہمار موئیم خرید گیا۔ چند ایک تاش کی گذیاں ملنگوائی لگیں جب بھی بحث کا آغاز ہوتا تو ایک آدمی ہمار موئیم بجانے پر تعینات کیا جاتا۔ تاکہ باجے کے شور میں بات سنائی نہ دے اور سازشی ہر وقت تاش کے پتے تھے رہتے تاکہ کوئی جانے تو بھلے تاش کھلنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کہیں سے ایک پرانا ہمارا پرانا حاصل کیا گیا اور شیخ کے خلاف گنمام چھپیوں کا ایک سلسہ شروع کر دیا گیا۔

ان چھپیوں کا انداز انوکھا تھا اور ایلی نے اتر زماں انہیں ایسی شکل دی کہ وہ عام گنمام چھپیوں سے بہت کروں تاکہ افسران بالا انہیں چھپی سے پڑھیں۔ دوسرا بات یہ تھی کہ وہ نہایت مختصر ہوتیں، زبان میں دفتری انداز مفقود ہوتا۔ کوشش کی جاتی ان میں مزاح کارنگ غالب رہے، مظلومیت اور شکایت کا عنصر نہ ہو۔

ڈویژنل اسپاکٹر کو روز ایک چھپی لکھی جاتی جس کا مستقل عنوان اپیشن تھا۔ مستقل عنوان کے نیچے ایک ذیلی عنوان ہوتا۔ اس کے نیچے سیریل نمبر اور نیچے نفس مضمون۔

مثال

فلائن سال میں ۱۲۰۰ اروپیہ بھار ریلیف فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ چار صدر و پیغمبر کاری بنک میں جمع کرایا گیا۔

باقی آٹھ سور پیہ کیا ہوا؟

باقی آٹھ سور و پیہ کیا ہوا؟

ان انوکھے خطوط وجہ سے ڈویٹل ففتر میں ایک شور میں شور ساچ گیا۔ پرانے افران حیران تھے کہ یہ گنام خط کیسے ہیں؟ ایسے گنام خط تو کبھی موصول نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر معروف نہیں پڑھ کر محفوظ ہو رہے تھے۔ فالبا انہیں اس بات پر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنے ملک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسے نکلین قسم کے شکایتی خط لکھنے کی امیت رکھتے ہیں۔

شیخ مسعود کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یا اللہ یہ کیسے گنام خط ہیں؟ اور ان کا جواب کس طرح دیا جا سکتا ہے؟ اور لکھنے والا کون ہے؟ اور یہ انداز سے کچھ سمجھیں ہیں آرہا تھا لیکن شیخ کارنگ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ خطوط کا یہ سلسہ لامناہی ہے تو اس پر وحشت اور دیوانگی طاری ہو گئی۔

اس نے ایلی کو اپنے کمرے میں بلایا اور چاروں طرف کے دروازے بند کر کے کھنے لگا:

”کیوں بھی آ صفائی صاحب۔ آج کل کچھ دور رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ مجھ سے ناراضگی ہے کیا؟“

ایلی نے ایک ساعت کے لئے سوچا کہ اسے کیا روایہ اختیار کرنا چاہیے۔ بہر صورت ایلی طبعی طور پر سمجھی رویے کا حامی نہ تھا لہذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عام سازشی نہیں بنے گا اور یہ نہ کہے گا۔ اچھا۔ یہ بات ہے۔ یا آخر بات کیا ہے۔“

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں اور جان بوجھ کر آپ سے دور دو رہتا ہوں۔“

شیخ بھونچ کا سارہ گیا۔ کیا وجہ ہے۔ اس نے کہا۔

” وجہ آپ کو معلوم ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ الثاچور ہے۔

شیخ اور گھبرا یا۔ ” مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔ وہ بولا۔

” آپ سمجھتے نہیں جانتے ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں۔ ایلی نے جواب دیا۔ اور شیخ کو مزید پریشانی سے بچانے کیلئے اس نے بات کی وضاحت کی۔ دیکھئے شیخ صاحب۔ وہ بولا۔ گزشتہ دو تین روز سے آپ پریشان ہیں۔ آپ کا چہرہ۔ آپ کی چال ڈھال، آپ کی باتیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرائے ہوئے ہیں اور سوچ بچاہر میں پڑے ہیں۔ صرف آپ کی زبان خاموش ہے باقی تمام اعضاء چلا چلا کروہ راز کہہ رہے ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ وہ راز آپ نے ول میں چھپا کر کھا ہے۔ ایلی نسلیے لگا۔

شیخ کا رنگ فتن ہو گیا۔ اس نے پہنچی مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی؟ وہ بولا۔ تو کیا آپ اسی لئے مجھے نے ناراض ہیں؟“

” ناراض اس لئے ہوں ایلی نے کہا۔ کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ مجھے بات نہیں بتا رہے۔“

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

اب ہنسنے نہیں شیخ صاحب۔ ایلی جلال میں آ کر بولا۔ ایسا راز رکھنے کا فائدہ جس کا آپ کے جسم کا بند بند اعلان کر رہا ہے۔“

اوہ ہوں۔ ایلی بولا۔ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں جسے آپ بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اگر چہ مجھے اسے جانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اسے بتائیے جس پر آپ کو اعتماد ہے۔“

اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں۔ شیخ ہشنے لگا۔

” تو نہ بتائیے۔ لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ضبط سے کام لیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ کوئی چیز اندر آپ کو کھائے جا رہی ہے۔“

شیخ کھسیانہ ہو گیا۔

ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں شیخ اے اس امر میں راز داں نہ بنالے۔ اس حد تک دو ہرا روں ادا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہر حال اس کی باتیں سن کر شیخ اور بھی گھبرا گیا اور ایلی کو شیخ سے دور رہنے کا جواز مل گیا۔

مسلسل ایک ماہ کی جواب طبیوں پر شیخ کے صبر کا پیان لپریز ہو گیا۔ اسے شک تو ہر استاد پر تھا لیکن اسے یہ ثبوت نہ مل سکا کہ کون اس کے خلاف خط لکھ رہا ہے اور شکایت کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ ان کا جواب اس سے بننا آتا تھا۔ اس کے پرانے ہنگامہ میں سب قابل ہو چکے تھے۔

شاید اسی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ کار آزمائے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک خصوصی ٹاف میلنگ بلائی اور استاد تذہب کو جمع کر کے سب کے سامنے اس نے وہ راز فشا کر دیا۔

”حضرات۔“ وہ بولا۔ یہ میلنگ میں اس لئے منعقد کی ہے کہ میں آپ سے برادرانہ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف مسلسل شکایات لکھ کر بھیج رہا ہے۔ اس معاملے کو چلتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس صاحب کو مجھ سے شکایت ہے اور یہ ہم چلا رہا ہے وہ میرے روپرو آجائے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں گا۔ بلکہ میں اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں اور اس کی جائز شکایات وور کرنے کے لئے کوشش کروں گا۔“

شیخ یہ کہہ کر رک گیا تمام اساتذہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دریتک وہ انہیں نگاہوں سے کرید تارہا۔
ایلی اٹھ بیٹھا۔

”میں دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا۔
”پوچھئے آصفی صاحب۔“

”یہ بتائیئے کہ شکایات کی نوعیت کیا ہے؟“

ایک ساعت کے لئے شیخ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب عادت بات نالے کیلئے اس نے کہا:

”بس معمولی قسم کی شکایات اور ادھری۔“
”لیکن حضور،“ چودھری کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”ایسی گم نام شکایات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کرنے و تجھے خود ہی تحکم کر رک جائے گا۔“
”آپ کو کسی پر شک ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔
”شک تو مجھے آمنی صاحب آپ پر بھی نہیں ہے اور وہ نہیں لگتا۔
سارا شاف قہقہہ مار کر نہیں پا سکتا۔“
”یہ خط۔ شیخ نے وضاحت کی۔“ جدید انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور جدید ترین ٹھیکر اس سکول میں صرف آپ ہیں۔ اور ان سپکھر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے نام لکھنے بھیجوں جن پر مجھے شک ہے۔“

”ہاں ہاں تو ضرور لکھنے میرا نام۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو پھر اقبال کرونا کہ تمہیں مجھ سے شکایات ہیں۔ شیخ ہٹنے لگا۔

”ہاں۔ مجھے آپ سے دو شکایات ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ پہلی شکایت یہ ہے کہ آپ نے دو ماہ تک ہم سے یہ بات چھپائے رکھی اور نہ شاید حالات اس حد تک نہ بگزتے اور دوسرا شکایت یہ کہ آپ ہم سے تو مطالباً کرتے ہیں کہ ہم آپ پر اعتاد کریں لیکن آپ کو ہم سے کسی شخص پر اعتاد نہیں۔“
سارا شاف حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔

مسٹر معروف

عین اس وقت تاروا لاڑا کیہ داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شیخ ازسر نو گھبرا گیا۔
”کیوں؟“ وہ بولا۔ کوئی تار ہے کیا میرے واسطے؟“

”غہیں جی۔“ وہ بولا۔ الیاس آصفی کے نام کا ہے۔ ”اس نے ایک تارا میلی کی طرف بڑھادیا۔

ایلی نے تارکھول کر پڑھا۔

”کیوں خیریت تو ہے؟ شیخ نے پوچھا۔“
”جی ہاں بالکل۔ ایلی نے جواب دیا۔ والد صاحب نے مجھے خان پور بلایا ہے۔“

”خیر سے بلایا ہے کیا؟“

”لکھا ہے مسٹر معروف تم سے مانا چاہتے ہیں اللہ“

”مسٹر معروف تم سے مانا چاہتے ہیں لیکن یوں؟“

”مجھے نہیں علم۔ ایلی نے جواب دیا۔ وہ والد صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ شاید میری تعیناتی کی بات ہو گئی۔“

ایلی خان پور پہنچا تو گھر میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال تھا نہ جانے کتنی اہم بات ہو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔ شاید مسٹر معروف کو شک پڑ گیا ہو کہ وہ جاورا بلیٹن کا ایڈیٹر ہے یا کسی نے بھید کھول دیا ہو۔ ممکن ہے شیخ مسعود نے خود شکایت کی ہو۔ بہر صورت بات اہم تھی لیکن وہاں جا کر اس نے اس محسوس کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”اچھا ایلی آیا ہے۔“ علی احمد نے اسکی آمد کی خبر سن کر کہا۔ بہت اچھا کیا جو آگئے۔ یہ ایلی تو نصیر کی ماں گویا جاورے کا بن کر رہ گیا۔“

”معروف صاحب کی کیا بات ہے؟ ایلی نے دلبی زبان سے پوچھا۔“

”بھی مجھے تو معلوم نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنے ان سے تعلقات ہیں۔ سبھی افسر عزت کرتے ہیں۔ دوستان سلوک سمجھ لو۔ یہاں کی محبت ہے ورنہ۔۔۔ خیر خیر تو وہاں چائے پارٹی پر بیٹھے جاتے۔ اتفاق سے جاورے کی بات چل پڑی تو میں نے ڈپٹی

کمشنر صاحب سے کہا ہمارا ارادہ ہے وہاں جانے کا۔ اپنا لڑکا ہے نا وہاں۔ اس بات پر مسٹر معروف چونکے۔ اچھا تو الیاس وہاں ہے آج کل۔ آپ ہی نے تو تعیناتی کی تھی، میں نے جواب دیا۔ اس پروہابو لے تو اسے بلا لوہہ ایک دن کیلئے اور جب وہ یہاں آئے تو فرمایہ ری کوئی پر بھجوادینا ہی ہی ہی ہی۔ ”علی احمد ہنسنے لگے۔“ وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ سمجھی افسر تمہیں جانتے ہیں۔ سمجھی بلکہ اکثر باتوں میں تمہارا مذکورہ آ جاتا ہے نا اس لئے۔ دوست جو ہوئے اپنے کیوں نصیر کی ماں تو کیا دیکھ رہی ہے یوں۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو بات کو میں بتاؤں بالکل بے کار ہے۔ سمجھ کا خانہ ہی جونہ ہوتی پھر کوشش بے کار ہے۔ ہی ہی ہی۔ کیوں نہیں۔ کیا یہ غلط ہے۔ ہی ہی ہی۔

”اچھا بھی ایلی آج شام کو تم معروف صاحب سے ضرور مل لینا۔ انکی کوئی سے
واقف ہونا۔ دنیا کی دوکان کے باہمیں ہاتھ صدر میں۔ تم شام کو آٹھ بجے پہنچ جانا
ورنہ وہ کلب ولب چلے جاتے ہیں۔ بیرے کو بلا کر کہنا میں آصفی صاحب کا پیٹا
ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے جب جاؤں بڑی خاطر مدارت کرتا ہے جملیہ ہے نا۔ یہ
جملیے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور معروف صاحب کو یاد دلا دینا کہ تم آصفی
صاحب کے بیٹے ہو ورنہ شاید انہیں یاد نہ رہے۔ ہی ہی ہی۔ ” وہ ہنسنے لگے۔ ” یہ
ہو کر تمہیں واپس لوٹا دیں۔ ہی ہی ہی ہاں بھی تم جیسے ماتحت تو ان کے سینکڑوں
ہیں۔ بے چارے ملنے کو ترستے ہیں لیکن رسائی نہیں ہوتی۔ اور تم۔ تمہیں تو خود تار
دوے کر بولایا ہے انہوں نے۔ ”

”آصفی صاحب نے دوستانہ جو ہوا نصیر کی ماں نے طفرائے۔
علیٰ احمد ملنے لگے۔

مستر معروف ایک خوب صورت رکھیں مزاج، خاموش اور نسائیت سے بھرے ہوئے نوجوان تھے۔ وہ عام انپکٹروں سے قطعی طور پر مختلف تھے اور ان کا اندازہ بالکل انوکھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ براہ راست اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ویسے عام طور پر محلہ تعلیم کے افسر بتاریخ ترقی کرنے کے بعد ڈویرٹل انپکٹر بن کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً وہ پہلے ڈویرٹل انپکٹر تھے جو ولایت سے ڈگری حاصل کر کے آئے تھے۔ پرانے افراد کا طرز عمل عمل تحصیل دا اور پیواری کے بین بین ہوا کرتے تھے۔ وہ ویکھنے کی بجائے گھورتے۔ بات کرنے کی بجائے ڈانٹتے اور اساتذہ سے دوسرے تھے تھے۔ اس کے یہ عکس معروف نہایت اخلاق سے ملتے یوں باقیت کرتے جیسے وہ افسری بین اور ڈانٹنے کے لئے تو وہ بالکل ناواقف تھے۔

ایلی معروف سے مل گر جی ان رہ گیا۔ معروف نے اسے پاس بھالیا۔ سگریٹ پیش کیا اور پھر یوں باتوں میں معروف ہو گئے جیسے ایلی کو صرف نبیل ٹاک کے لئے بلا یا ہو۔

پھر دفلتا انہوں نے موضوع بدلا اور جاورا کے متعلق پوچھنے لگے۔ کیا وہ اچھی جگہ ہے؟ موسم کیما ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ سکول کیما ہے؟ آپ کا دل لگ گیا کیا؟ پہلے تو ایلی بے پرواں سے ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا پھر دفلتا اسے خیال آیا کہ شاید جاورا بلیشن کا بھید پانے کے لئے اس سے حالات پوچھ رہے تھے۔ اس پر ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شیخ صاحب کے خلاف کوئی بات نہ کرے گا۔

”ہاں تو الیاس صاحب۔ آپ کے سکول میں تو پارٹی ہندی نہیں ہو گی کوئی؟۔“
معروف نے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھی۔ وہ بولا۔“

”ہیڈ ماسٹر تو وہاں کے بہت قابل اور کارکن آدمی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ اور بے حد لچکپ ہیں۔“

معروف صاحب نے طرح طرح سے ایلی کی بات کرنے پر اکسایا لیکن اس نے انہیں سرسری جواب دیکرناہ دیا۔

آخر ہوں نے واضح بات کی
”دیکھو والیاں میں نے تمہیں صرف اس لئے بوا یا ہے کہ جا و ر اسکول میں سخت گڑ بڑ ہے، معلوم ہوتا ہے کچھ لوگ ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور چونکہ میرا اصول ہے کہ ایسے سازشوں کو سخت سزا دیتا ہوں اس لئے تم خاص طور پر خیال رکھو۔ ایسے لوگوں سے مت نہو بلکہ اگر پتہ چلتا تو انہیں بتاؤ کہ وہ کون ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ایک دوست کا لڑکا ایسے یہیں میں بھے گتا نہ ہے۔“

معروف صاحب نے اٹھ کر اس سے مصالحت کیا اور ایلی گھر چلا آیا۔

انگلے روپ معروف نے غالباً علی احمد سے بھی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دون وہ اسے نصیحتیں کرتے رہے۔

دیکھو ہا ایلی ایسے لوگ ملازمت میں کبھی فائدے میں نہیں رہے جو اس قسم کی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں ہمیشہ اپنے افسر سے بنا کر رکھنی چاہیے۔۔۔ چاہیے دوسروں سے اس کا سلوک کیا بھی ہو میں اس سے کیا۔ تم ہمیشہ ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دینا اور بلکہ اگر تمہارا کوئی جانے والا اس سازش میں شریک ہو تو اسے بھی خبردار کر دینا۔ اس کا بھلا کر دینا چونکہ معروف صاحب بہت سخت ایکشن لیں گے۔ یہ وہ کی مہربانی ہے کہ تمہیں خود بلا کر بات سمجھادی ہے۔ تم میرے بیٹے ہو اس لئے۔ ورنہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ایک معمولی ٹیچر۔ ایسے سینکڑوں ٹیچر مارے مارے پھرتے ہیں کون پوچھتا ہے۔ جی اور اگر یاں انگلی قیمت کیا ہے آج کل۔۔۔ اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو کیا تمہیں نوکری مل جاتی۔ اجی تو بہ کرو۔ کون پوچھتا ہے۔۔۔ ہی ہی ہی۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

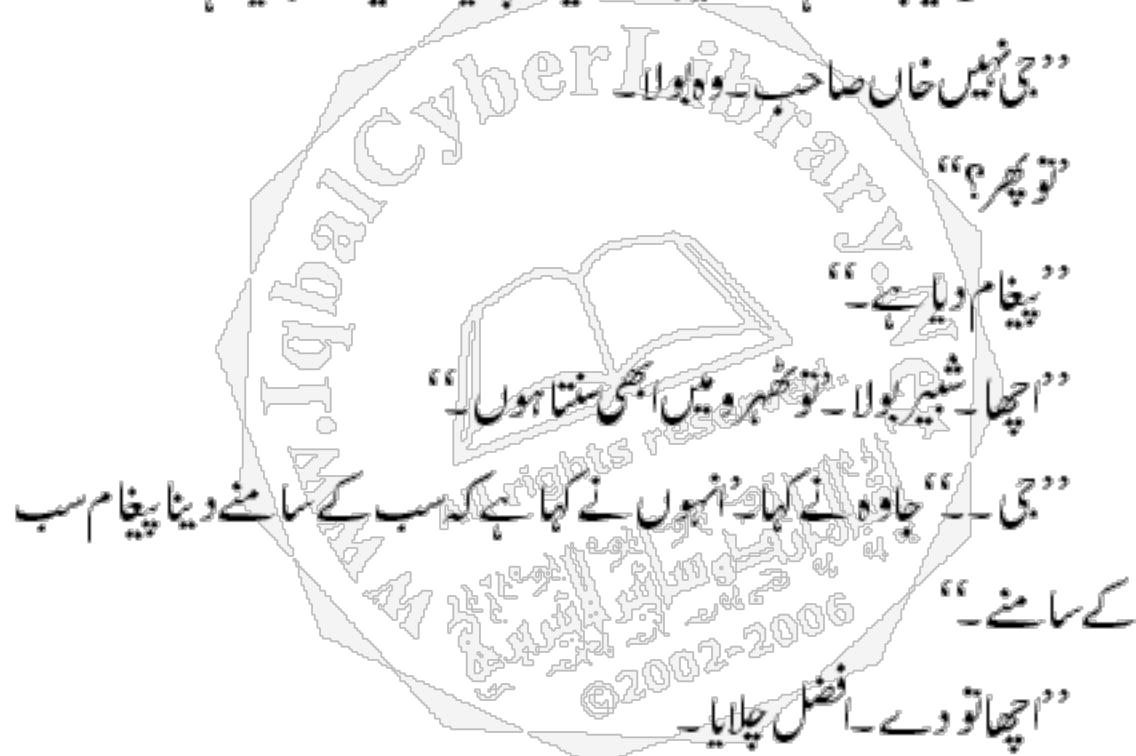
گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا کہ مسٹر معروف کا مجھے بلانے سے یہ مقصد تھا کہ جاورا کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ انہوں معرف کو صحیح حالات جاننے کی خواہش نہیں اسے اس بات سے دل چھپی نہیں کہ لظم و نق کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ انہیں تو صرف یہ فکر رامن گیر ہے کہ کسی جائز یا ناجائز طریقے سے لظم و نق قائم کیا جائے قائم رکھا جائے۔ جبکہ انہوں نے مجھے بلوایا تھا تا کہ میری معرفت ان لوگوں کو ڈرایا جائے کہ ایسی سازشوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور سازشوں کو اسکر صاحب بخت نہ ادینے کے قائل ہیں۔

جاورا پہنچ کر ایلی نے ناری بات کا رنگ ہی بدل دیا۔ سازشوں کی محفل میں اس نے ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر معروف الصلاف کرنے کے قائل تھے لیکن وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو جرأت سے شکایت نہیں کر سکتے اور شیخ صاحب کے پاس جا کر اس نے انہیں بتایا کہ معروف آپ کے بڑے مداح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے سمجھوتہ کریں جنہیں آپ سے شکایات ہے تا کہ جاورا اسکول کی مزید بدنامی نہ ہو۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایلی واپس جاورا پہنچا تو جاورا اسکول کی ساریں اور تقویت پکڑ گئیں۔ وہ لوگ جو تفریح سازشوں کا ساتھ دے رہے تھے اس میں نمایاں حصہ لینے لگے۔ بلکہ انہیں کے لئے تازہ مواد و متاب ہونے لگا۔ اور شیخ مسعود اس کا مقابلہ کرنے کی امید کھو بیٹھے اور انتہائی خطرناک اقدام کو عمل میں لانے کی سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈپی کمشن پیش پولیس۔ سی آئی ڈی اور رسول پولیس سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اپنے پرانے ہتھکنڈوں کے مطابق وہ اس بات کے قائل تھے کہ دشمن پر سخت وار کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں لگ جائے اور مزید وارنہ کر سکے۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جب وہ سب مل کر ایک نئی اسکیم پر بحث کر رہے تھے تو شبیر کا بھانجہ جاوہ داخل ہوا۔ اس کی عمر نو سال کی ہو گی۔

”کیوں کیا بات ہے۔“ شبیر سے دیکھ کر چلا یا۔ ”کیا مجھے بلا یا ہے؟“



”جی۔“ جاوہ نے کہا۔ انہوں نے کہا ہے کہ سب کے سامنے دینا پیغام سب کے سامنے۔“

”اچھا تو دے۔“ افضل چلا یا۔ ”جی انہوں نے کہا ہے کہ جا کر کہہ دو اگر خان صاحب اس گھر میں پھر داخل ہوئے تو میں شیخ کے گھر جا کر ساری بات بتاؤں گی۔“

”کیا کہا؟ سب کے سامنے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔“

”جی۔“

”کس نے کہا تھا۔“

”شبیر کی بیگم نے اور کس نے۔“ افضل یو لا۔

”ویسے ہی رب ڈاٹی ہے اور کیا۔“

”اوہ نہ۔“ شبیر یو لا۔ یہ نہ کہو تم اس سے واقف نہیں۔ وہ کر گز رے گی۔ وہ بڑی ضدی ہوتے ہے۔

”تو پھر نہ آیا کرو یہاں۔“ افضل یو لا۔

”اے تم سب سے نفرت ہے۔“ شبیر یو لا۔ وہ اس مکان کو بہت برا بھتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کرو۔ شیخ کے گھر جا کر اسے صورت حال سے مطلع کر دے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔ احمد نے بھیجتے ہوئے پوچھا۔

”کرنا کیا ہے۔ چودھری نے کہا۔ آخر ایک نایک دن تو بات لٹکے گی۔“

شبیر کی بیوی کے رخ کو بدلا آسان کام نہ تھا۔ اسے راز فاش کرنے سے باز رکھنے کی صرف ایک صورت تھیں کہ شبیر کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ لیکن شبیر نے اعلان کر دیا۔ میں مجبور ہوں چاہے لاکھو شکر روں میں تم سے ملنے سے باز نہ رہ سکوں گا۔“

”تو پھر اپنی بیوی کا ذمہ لو کر وہ ایسی واہیات حرکت نہ کرے گی۔ افضل نے کہا۔

”نہ بھائی۔ وہ والا۔ یہ میرے بس کاروں نہیں۔“

اس نے جھمیلے کی وجہ سے نظر والے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ سب گھری سوچ میں پڑ گئے۔

شبیر کی بیوی کو ہر اس مکان سے نفرت تھی۔ جس میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق صرف وہی مرد معزز ہو سکتا تھا۔ جس کے گھر ایک اپنی بیاہتا بیوی ہو اور چونکہ افضل اور ایلی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی۔ لہذا اساری دنیا کے گناہ اس مکان میں ہوتے تھے۔ وہاں تاش کھیلا جاتا تھا۔ واہیات گفتگو ہوتی تھی۔ شراب پی جاتی تھی۔ جو اکھیلا جاتا تھا۔ رغذیاں آتی تھیں۔

ان حالات میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے خیالات کو بدلا نا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔

”بھی کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ افضل بولا۔

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا۔“ لیکن اس کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی طرح کوشش کرے۔

ساری رات وہ سوچتا رہا پھر دفعتا اسے دعوت کا خیال آگیا جو شبیر نے انہیں کھلائی تھی۔

اس دعوت کے کوائف بھی انوکھے تھے۔

کریلے

ایک مرتبہ انہوں نے شبیر کو مجبور کیا کہ وہ انہیں دعوت کھلانے۔ پہلے تو شبیر انہیں نال تارہا لیکن آخر اس نے محسوس کیا کہ دعوت کھلانے بغیر چارہ نہیں اس نے ایک دن مقرر کر دیا۔ مقررہ دن وہ سب تیار بیٹھے رہے کہ کب بلا و آئے۔ آخر شبیر آیا اور کہنے لگا۔ لو بھی ابھی کھانا آتا ہے۔“

”آتا ہے گیا مطلب؟ فضل نے کہا کیا ہم تمہارے گھر نہ جائیں گے۔“

”نہیں یا رہو رہو لا۔ وہاں جا کر کھانے کا کیا مزا۔ یہیں بھجوادیتا ہوں میں تم میری بیوی کی عادت سے واقف نہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو سار مزا کر کر ہو جائیگا۔“

اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شبیر کا بھانجا جاوہ ہاتھ میں ڈرے اٹھائے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن انکی حیرت کی انتہاری جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں آنے کے بجائے وہ سیدھا آگے نکل گیا۔

انہوں نے جاوہ کو آوازیں دیں شور مچایا مگر وہ چپ چاپ سیدھا نکل گیا۔

”بیگم کی سہیلی کے ہاں کھانا پہنچانے گیا ہے۔ شبیر بولا۔ ابھی واپس آ کر ہمارا کھانا لے آئے گا۔ گھبراو نہیں۔ کچھ دیر کے بعد جاوہ وہی بھرا ہوا ڈرے اٹھائے واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر شبیر بولا۔

”اچھا تو کیا وہ لوگ گھر نہیں ملے؟ اچھا تو انہیں پھر دے آنا۔ یہ ہمیں دے دو۔

شبیر نے کچھ اس انداز سے بات کی کا فضل اور ایلی کو سمجھ میں نہ آیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ شبیر کی بیوی ایلی اور افضل سے مشتمل وں کا کھانا پکانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے شبیر نے یہ بہانہ بنایا تھا کہ مسجد میں وہ ولی اللہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت کرنا ہے۔ بیگم اس کی چال میں آگئی اور اس نے کھانا تیار کر دیا۔

جب جاوہ کھانا لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوا تو حسب عادت دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ نکڑوا لے مکان پر تو نہیں رکتا اور شبیر کی ہدایات کے مطابق جاوہ سیدھا نکل گیا تھا اور موڑ مڑنے کے بعد کچھ دیر و بیان انتظار کرتا رہا تھا تاکہ بیگم شبیر مطمئن ہو کر اپنے کام کا ج میں لگ جانے اور وہ کھانا لے کر لوٹ آئے۔

بہر حال ایلی اور فضل کو اس بھیڈ کا علم نہ تھا۔ انکا یہ خیال تھا کہ شبیر نے منتین کر کے بیوی کو دعوت پکانے پر تیار کر لیا ہے۔
اس رات اسے خیال آیا کہ بیگم شبیر کو راضی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اگے روز ایلی نے گھر کا دروازہ جا ٹکٹکھلیا۔

”کیوں بھی۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”شبیر کہاں ہے؟“
”وہ تو ابھی سکول سے غمیں آئے۔ جاوہ بولا۔“

ایلی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ لیکن شبیر تو آج سکول آیا ہی نہیں تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بیگم بات سنکر چونک جائے۔

”گھر سے تو سکول ہی گئے تھے جاوہ نے کہا۔“

”میں نے کہا جاوہ۔ ایلی بڑے راز دانہ انداز سے بولا۔ تمہارے گھر جب بھی کر لیے کپیں تو یار جھوڑے سے مجھے دینا۔ اتنے اچھے کر لیے تمہارے ہاں بنتے ہیں۔ کہ جواب نہیں۔ یا م مجھے کر لیے بے حد پسند ہیں۔“
جاوہ چپ چاپ کھڑا تھا۔

ایلی نے آواز اور آہستہ کر لی اور بولا۔ چاہے چرا کر کھلا و لیکن صرف ایک بار کھلا دو صرف ایک مرتبہ تمہارے گھر کے پکے ہوئے کر لیے کھائے ہیں۔ اس روز جب شبیر نے ہماری دعوت کی تھی۔ کھلا و گے یا ر؟، اس نے کہا۔ گھر نہ بتانا۔ چوری چوری کھلا دینا۔ ضرور۔، ایلی کو اچھی طرح علم تھا کہ شبیر کی بیگم بڑی غور سے اس کی ہر بات سن رہی ہے اس نے اس کی بہت منتین کریں اور پھر چلا آیا۔

گھر آ کر اس نے افضل کو کہا۔ بھی پتھر تو پھینک آیا ہوں اب پڑھنیں کیسی لہریں اٹھیں یا تو کشتنی ڈوب گئی اور یا کنارے جا گئی۔“

”کیسا پتھر پھینکا ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”بس سمجھو لو پتھر تھا۔ اب تو لہریں دیکھو۔ رات کو شیر آیا تو اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔“ یا ریہ کیا تحریر کر دیا تم نے الیاس حد ہو گئی۔“

”کیوں کیا بات ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”بات؟ وہ بولا۔ بات کہاں تو مجڑہ ہو چکا ہے۔“

”مجڑہ۔ افضل نے دہرا دیا۔ پچھلے بھی ہرے یار۔“

”بات بتانے سے پہلے میں تمہیں پچھلا قصہ سنادوں شیر نے کہا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے مجھ سے دعوت کھلانے کی بات کی تھی تو میں نے اپنی بیوی سے اس کا مذکورہ نہیں کیا تھا۔ وہ تمہارے لئے دعوت پکائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے کہا تھا کہ مسجد میں دو مولوی ٹھہرے ہوئے ہیں ان کی دعوت کرنی ہے۔“

ارے۔ افضل چلا یا۔

”اچھا۔“ ایلی بولا۔ جبی جاوہ پہلے خوان لے کر آگے چلا گیا تھا۔“

”بھی بیگم تو تمہارا نام تک سننے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آج۔ معلوم ہے آج کیا مطالبہ کیا ہے اس نے؟“

”کیا؟ افضل بولا۔

”کہ کل تمام سامان خرید کر لاو میں ان کی دعوت کروں گی۔“

”کس کی؟“ افضل چلا یا۔

”بھی تمہاری اور کس کی۔“ شیر ہنسنے لگا۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا

تحانے جانے آصفی نے وہاں جا کر کیا کیا ہے۔ نقشہ ہی بدل گیا ہے گھر کا۔“

”لیکن یہ ہوا کیسے؟ ساری بات بتاؤ یا افضل بولا۔

”گھر لوٹا تو پہلے تو جواب ٹلی ہوئی کہ بتاؤ آج سکول کیوں نہیں گئے تھے اور گئے کہاں تھے۔ پھر دوسری جواب ٹلی ہوئی۔ لہنے لگی اس روز مجھے دھوکا دیا تھا۔ دعوت دوستوں کی کی تھی اور بہانہ مولوی صاحب کا بنایا تھا۔ بیکم کو یہ شکایت ہے۔ وہ بہتے ہوئے بول لے کہ اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو مجھے بتایا ہوتا تا کہ میں دل لگا کر پکاتی۔ میں نے تو یہی یہ پروائی سے کھانا پکایا تھا۔ جیسا تھا ہے یا۔“

”تو تیرناٹ نے پر بیجا لیلی ہٹنے لگا۔

”سبحان اللہ کیا تیر ہے اور کیا تیر لداز ہے۔ شیبر نے کہا۔ ایسی بات کر دکھائی ہے تم نے جو میری دانت ممکن ہی نہ تھی۔“

”چلو،“ ایلی بولا۔ شیخ سے جا کر شکایت کرنے کا خطرہ تو ٹھیک گیا۔“

”ارے،“ شیبر چلا یا۔ ”تو کیا اس لیے یہ چلا یا ہے۔“

اور کیا دعوت کھانے کیلئے،“ ایلی ہٹنے لگا۔

میم

”میں دعوت کھانے کیلئے ہی آیا ہوں۔ محمود داخل ہو کر بولا۔

”ارے تم؟“ ایلی اسے دیکھ کر چلا یا۔ تم یہاں کہاں؟“

”دیکھ لو۔ وہ بولا۔ ڈھونڈ ہی نکالا تمہیں۔“

”لیکن اس وقت کوئی گاڑی سے آئے ہو؟“ ایلی نے پوچھا۔

”گاڑی کا تو وقت نہیں۔ افضل بولا۔

”میں موڑ سے آیا ہوں۔“ محمود سکرانے لگا۔

”بس سے اس وقت۔“

”تو کیا کار سے آئے ہو۔ ایلی نے طفر اکھا۔“

”ہاں ہاں کار سے بیٹھ کر سب کھاناوں گا۔

”اچھا تو بیٹھ جا۔ ایلی نے کہا۔ پہلے ہماری بھجن منڈلی کی کھاسن لوپھر تمہاری کھا بھی سن لیں گے۔ چلو بھئی۔ ایلی چلا یا۔ پہلے کام پھر کلام۔“

اس پر اس کے ساتھی حسول میں بٹ گئے۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر ہار موئیم بجائے لگے۔ چارتاش کھلینے میں معروف ہو گئے۔ کھیلتا تو کیا تھا وہ یوں شور مچانے لگے۔ جیسے تاش کھلیں رہے ہوں۔ ایلی نے اٹھ کر اپلوں کے ذمیر تلے سے ناپ مشین نکالی اور ناپ کرنے لگا۔

”اے محمود جہر تھے چلا یا۔ یہ کیسی کھانہ ہے۔“

”یہ سازش ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔
”سازش۔“ محمود کی آنکھوں میں پنکا لبرائی۔

اب کی بار محمود آیا تو اس کاحد و دار بعد بدله ہوا تھا۔ وورومی ٹوپی اور شلوار قابض تھیں شلوار کی جگہ پتوں نے لے لی تھی اور سر نگا تھا۔

جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو انہوں نے بات چھیڑی۔

”کہاں ہوتا آج کل؟“ ایلی نے پوچھا۔

”یہی تو مجھے معلوم نہیں۔ محمود نے کہا۔

”آخر کہیں تو ہو گے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

”کیا وہ پاپور ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ مجھے تبدیل کر دیا ہے۔“

”کہاں؟“

”لاسلک پور۔“

”لاکل پور میں تو کوئی گورنمنٹ سکول نہیں۔“

”کوئی نہیں۔ وہ مسکرا یا۔

”تو پھر؟“ میں نے پیغمبر کے حکم میں نوکری کرنی ہے لیکن۔“

یار میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔ محمود نے جملہ ختم کر لیا۔

”کیوں؟“

”اس حکم میں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔“

”اس میں کیا وقت ہے۔“

جس افسر کے ساتھ میں ہوں وہ تو ہر بات میں جذباتی پہلو مدنظر رکھتی ہے۔

پھول دیکھ لے تو یوں خوشی سے ناچتی ہے جیسے زندگانے کیا ویکھ لیا ہو۔ کوئی نوکر آ کر اپنا دکھڑا رو دے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ہر بات میں ذاتی زاویہ ہر معاملے میں پرنسپل دیوانہ بھی ان کے ساتھ میرا لگزار نہیں۔“

”تم بھی جذباتی پہلو اختیار کر لو۔“

”حصورت کے ساتھ میں تو صرف ایک ہی پہلو اختیار کر سکتا ہوں۔ وہ ہشتنے لگا۔

”تو کرو۔ ایلی نے کہا۔

”نوکری ہاتھ سے جائیگی۔“

”جانے لگتو سامنے جا کر رو دینا۔ وہ بھی رو پڑے گی بات ختم ہو جائے گی۔“

”جع۔“ محمود کی آنکھوں میں عجیب چمک لہر آئی۔

”تم خود ہی کہتے ہو۔ نوکر رکھنا نے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔“

”لیکن جذباتی پہلو اختیار کیسے کیا جائے۔ اسے پوچھا۔“

”یہ تو آسان ہے۔ ایلی نے کہا۔ نئے کپڑے پہننے تو شوق بھری نگاہوں سے دیکھوا رکھو یہ تو بڑا پیارالگتا ہے۔“

”یہ تو میں کرتے کرتے تھک گیا۔ وہ بولا۔ خوش تو ہو جاتی ہے وہ مگر میری طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھتی۔“

”خوب صورت ہے۔“

”ایسی خوب صورت تو نہیں لیکن میم ہے۔“

”میم۔“ ایلی اچھل کر بیٹھ گیا۔

”اور وہ جو دیکی ہوتی تو کیا تم سے ہی پوچھتا کر۔“

”کار میں کیسے آبے تھے؟“

”اسی کی کار ہے۔“ وہ بولا۔

”ارے تو کیا سن فنا پنچی کار دیدی تھیں یہاں آنے کے لیے؟“

”خود پہچانے آئی تھیں ہوئے۔“

”خود۔“

ایک ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

اور اب وہ کہاں ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”واپس چل گئی۔“

”واپس کہاں؟“

”لائل پور۔“

”تو کیا وہ تمہاری شوفر ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا کروں بھی واہ۔ ایلی ہنسا۔ جو آتا ہے، میں بے قوف بناتا ہے۔“

”یقین کرو۔ محمود بولا۔ میں خود بھی بے قوف بنا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا نہیں آتا سمجھ میں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں آتا۔“ وہ بولا۔ کسی وقت میری ہر بات مانتی ہے۔ کسی وقت بات نہیں ملتی۔ کسی وقت بات بات پر ضد کرتی ہے۔ جیسے ہر بات میری خواہش کے خلاف کرنے کی قسم کھائے بیٹھی ہو۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے جیسے مجھ سے بہت

قریب آگئی ہوا اور پھر ایک ساعت میں یوں دور چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ نہیں یا رہ چلا یا۔ میں تذبذب سے اکتا چکا ہوں۔ اگر میں اس زمانہ مجھے میں کام کرتا رہتا تو کسی روز موقوف ہو جاؤں گا۔

محمود کے آنے پر ایلی مسلسل دو روزاں کے پاس بیٹھا رہا وہ دونوں کتابوں کی باتیں کرتے رہے، آسفورڈ اشٹری کے محاوروں پر بحث کرتے رہے عورت کی نفیات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔

پھر محمود نے سوشن ورکروں کی بات چھیر دی۔ یارا میں یہ دنیا ہی نہ الی ہے۔ وہ بولا۔ یہ قوم جسے عورت کہتے ہیں۔ عجیب قوم ہے۔ قہقہوں میں روٹی ہے۔ آنسوؤں میں نہستی ہے۔ نکہم کو پچھلتائی ہے مال کہتا ہوئے جھجکتی ہے۔ میں آج کل الف لیلی کی دنیا میں جی رہا ہوں۔۔۔ وہاں خوبیہ سراہیں جنات ہیں۔“

ایلی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے پوم پوم کی آواز آئی۔

”اے یہ کیا ہے؟“ ایلی چلا یا۔

محمود کا رنگ فتح ہو گیا۔

”کار کا ہارن معلوم ہوتا ہے۔ ایلی نے کہا۔

”ہاں۔“

”کیا وہ خود لینے تو نہیں آگئی؟“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔“

”نہیں تو۔ وہ بولا۔ اس نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ ایک روز رہنا پھر چلے آنا اور آج دو روز ہو چکے ہیں۔“

تو یقیناً وہی ہے۔ ایلی نے کہا۔

محمود اٹھ کر باہر چلا گیا اور چند ساعت میں آ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ یار وہی ہے کہتی ہے چونکہ تم وعدے کے مطابق کل نہیں پہنچ تو میں لینے آئی ہوں۔

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ اچھا افسر ملا ہے تمہیں۔“

محمود نے اپنی چیزیں سوٹ کیس میں کھنی شروع کر دیں اور کہنے لگا۔ یار مجھے اس مجھے سے بچاؤ مجھے اپنا انجام اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

ایلی حیران تھا کہ ایسے سازگار حالات کے باوجود محمود وہاں سے تباولہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی حیران کن بات تھی اور پھر محمود جو طبعی طور پر لیدرین میں واقع ہوا تھا۔ جو عورتیں سے دوڑیوں محسوس کرتا تھا۔ جیسے کسی آبی جانور کو محرا میں پھینک دیا گیا ہو۔ زندگی کس قدر عجیب تھی۔

صلح اور جنگ

محمود کے جانے کے بعد ایلی سکول گیا تو شیخ کے تیور بالکل بدالے ہوئے تھے۔

”کہیے آصفی صاحب۔ شیخ اسے دیکھ کر بولا۔ یہ مصروف معلوم ہوتے ہیں آپ کو آج گل۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ شیخ کی بات طور بھری تھی۔ جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”عجیب مصروفیت ہے کہ آ ڈھی رات تک گھر با جے بجھتے ہیں۔“

”وہ تو بھیں گے۔ ایلی نے کہا۔

”خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”چج ہے۔“ شیخ بولا۔ دشمن پروار ہو رہے ہیں تو خوشی تو ہوتی ہے۔“

نہ جانے کیوں ایلی شیخ کی اس بات پر بگڑ گیا۔ اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ میں آپ کو دشمن سمجھتا ہوں تو چلے یونہی ہی۔“

شیخ نے قہقهہ لگایا۔

”شیخ صاحب آپ کے تقدیمے نہ گئے۔“

”کوشش تو بہت لوگوں نے۔“ شیخ ہستے ہوئے بولا۔

”جی۔ ایلی بولا۔ مجھے یہی حیرت ہے۔“

”اچھا ذرا آئیے تو یہی شیخ نے اپنا روایہ بدلا۔“

لیکن نہ جانے کیوں ایلی کو غصہ آگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہانے شیخ سے ناراض ہو جائے تاکہ اس دو رخی سے نجات حاصل ہو جس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس دو رخی پر اسے اپنے آپ سے فرست محسوس ہوتی تھی۔

”دنیمیں شیخ صاحب وہ بولا اس وقت فرست نہیں۔“

ایلی کے اس روایت کی وجہ سے شیخ ایلی کے ساتھیوں کو بلواتا اور ان سے کہتا بھی میری اور آصفی کی صلح کرادو اور وہ سب مل کر ایلی کو مجبور کر دیتے پھر یہ قافلہ شیخ کے گھر جا پہنچتا۔

وہاں پہنچ کر ایلی صاف صاف بھی محفل میں کہتا۔ مجھے شیخ صاحب سینکڑاف کوئی شکایت نہیں صرف اس بات کا رنج ہے کہ وہ مجھے پر شک کرتے ہیں اور پھر ان میں اتنی جرات نہیں کہ صاف صاف منہ پر کہہ دیں۔ نہیں صاف صاف نہیں کہتے بلکہ عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں۔ ”اس پر شیخ قسمیں کھاتا تاکہ مجھے آصفی پر شک نہیں۔“

شیخ کی یہ بات ہی چودھری شور مجاہد تا۔ چلی بھی صلح ہو گئی اب کوئی جھگڑا نہیں رہا۔ بآصفی شیخ صاحب سے بغل گیر ہو جائے۔ اٹھوآصفی۔ افضل اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ شبیر آہستہ سے چلاتا۔ اور مٹھائی۔ ”وہ تو ہو گی ضرور ہو گی۔ چودھری چیختا۔

پھر وہ سب بیٹھ کر مٹھائی کھاتے اور تقدیمے لگاتے ہوئے ایلی کے گھر کی طرف چل پڑتے۔ وہاں جا کر بابے بنجتے شروع ہو جاتے۔ تاش کی بازی لگ جاتی اور اپلوں کے انبار تلے سے ٹاپ کی مشین نکل آتی اور چودھری تقدیمے مار کر کہتا۔ لو بھی آصفی

آٹھوں کے بعد شیخ سے پھر بگڑ جانا تمہارا کیا بگڑے گامٹھائی مل جائے گی کیا حرج
ہے۔ شبیر قہقہہ لگاتا۔ ضرور ضرور۔“

احمدادی بجا تا۔

”بگڑ جائے کا بگڑ جائے گا۔ فضل بسجدی گی سے کہتا۔ میرا ذمہ رہا۔ لیکن تم صلح
کرنے میں دیرینہ لگاتا۔“

چودھری چلاتا۔ اس کا ذمہ میں آیتا ہوں۔“

انکے لیے یہ ایک نیا شغل تھا۔ جیسے یہ اُنی اور صلح کا ڈرامہ ڈرامہ کی حیثیت رکھتا
ہو۔ انکے نزدیک اسی بات نے سارش اور جنگ کے ایک ڈھپل کھیل میں
تبديل کر دیا تھا۔

پھر وہ بیگم شبیر تھی۔ ان سب نے ان کے پکاؤں کی تعریفیں کر کے اسے بالکل
رام کر لیا تھا۔ ہر مہینے وہ ان کو دعوت دیتی اور وہ اس کے گھر جا کر کھانا کھاتے اور
کھانے کے دوران بڑے اہتمام سے اس کے پکانے کی تعریفیں کرتے ان کی
تعریفیں سن کر شبیر زیر لب کہتا۔ ارے کم بختواب بس کرو میرا دیوالہ نکالنے پر
ادھار کھائے پیٹھے ہو۔ ابے او خبیثو کیوں اس نیک بخت کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیوں
میرا گھر اجائز رہے ہو۔ لیکن دل ہی دل میں وہ بھی خوش تھا۔ کیونکہ اب بیگم اس پر
پاہندیاں حاصل نہیں کرتی تھی۔

تت تت - بیچارا

بیگم شبیر کی اس تبدیلی کی وجہ صرف کریں نہیں تھے۔ ایلی نے بہت جلد محسوس کر
لیا تھا کہ خالی کر لیے دیر پاٹابت نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان بنیادی باتوں کے
متعلق کوئی بات نہ چھیڑی جائے جن کی بنار پر بیگم شبیر کو ان کے خلاف شکایت تھی۔
ایلی ابھی زندگی کی دلیزیر پر کھڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زندگی کا تارو پور کیا ہے۔
وہ صرف چند ایک تھیوریوں سے واقف تھا۔ جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اور

اے شوق تھا کہ تھیوریوں کو کام میں لائے اور دیکھئے کہ زندگی میں اور کیا اثر پیدا کرتی ہے۔ اس نے ان چند نظریات کو آزمادیکھا تھا اور اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے ان خیالات کو مزید آزمائے میں اسے راحت ہوتی تھی۔

ایک روز اس نے بڑی سنبھالی گئی سے شیر کو کہا تھا۔ شیر میرا ایک پیغام بیگم تک پہنچا
”دو۔“

شیر گھبرا گیا۔ نہیں یا رچھوڑ و اس بات کو اس نیک بخت کو زیادہ وق نہ کرو کہیں وہ بالکل ہی گزرنے جائے۔
نہیں یا رہو بولا۔ یہ خالی کر لیے درستک نہ چلیں گے۔
منتیں کر کے اس نے شیر کو منالی کیا تھا اور شیر نے ایلی کی ہدایات کے مطابق اپنی بیگم کو پیغام دے دیا تھا۔

”میں نے کہا۔“ شیر نے بیگم سے کہا۔ ایک کام کر دو تو بڑی مہربانی ہو گی تو اب کام ہے۔“
کیا ہے؟ وہ بولی۔

”یہ جو الیاس ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اچھی لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے۔“

”تو پھر کرتا کیوں نہیں۔ بیگم غصے میں چلائی۔“

”کسی اچھے رشتے کی تلاش ہے اسے۔ اچھی لڑکی ملتے تو کرے۔“

”تو کہے نا اپنے ماں باپ سے۔ وہ بولی۔ میں نے سنا ہے کہ ماں باپ کا کہا
نہیں مانتا وہ۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ شیر بولا۔“

”جو ماں باپ کا کہا نہیں مانتا وہ کیا انسان ہے۔ وہ غصے میں بولی۔“

”نہیں تم نہیں صحیح بیگم۔ وہ بولا۔ اسے ماں باپ کے چنان پر اعتماد نہیں۔“

”ہئے ماں باپ کے چنان پر اعتماد نہیں۔ بیگم چڑھی۔

دیکھوں۔ وہ بولا اس کی چار مائیں ہیں۔“

”چار مائیں۔ وہ چلاتی۔

”ہاں۔ شیر نے کہا۔ والد اپنی بھن میں لے گئے ہیں۔ والدہ کی کوئی ماننا نہیں۔“

”تت تت تت۔ بیگم پسچ کیں۔ بیچارو۔“

”کل بھری محفل میں کہہ رہا تھا۔۔۔ شیر رک گیا۔ لیکن چھوڑو اس بات کو۔“

”کہہ تو کیا کہہ رہا تھا۔ وہ مصروف ہو گئی۔“

”چلو چھوڑو۔ شیر نے کہا۔۔۔“

”چھوڑو کیوں۔“

”تم بر امانوگی۔“

”نہیں مانتی بر۔“

”چج؟“

”کہہ جو دیا۔“

”کہہ رہا تھا میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو اچھی اڑکی کا چنانہ کر سکتی ہو۔ صرف ایک بیگم شیر ہے۔ وہ ہنسنے لگا۔

”ولیے ہی انہاں شاپ بکتے رہتے ہیں یہ۔ وہ بولی۔

”نہیں نہیں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔“

”اچھا۔۔۔ وہ بولی تو کیا میں نے یہاں شادی ایجنسی کھول رکھی ہے۔ میں کیا کروں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ مقصد یہ ہے کہ الیاس چاہتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ ملتا تو تم جا کر اڑکی کو دیکھ لو۔“

”آخر کس قسم کی اڑکی چاہیے اسے۔“ بیگم نے پوچھا۔ ہے بے چارہ۔“

”بس ایک ہی شرط ہے اس کی۔“

”کیا؟“

”کہ لڑکی مغرب زدہ نہ ہو۔“

”کیاچ۔“ وہ حیران رہ گئی۔

”اچھا۔ میں تو تجھتی تھی۔“

شیر قہقہہ فارکر ہنسا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تمہاری بیگم کی کوئی چھوٹی بہن ہے۔ جس کی شادی نہ ہوتی ہوئے۔

شیر اور ایلی کو تجھی طرح سے علم تھا کہ بیگم شیر کی کوئی چھوٹی بہن نہیں اور اصولی طور پر بیاہ شادی کے جھمیلے میں پہنچنے کی قابلیتیں اس لئے انہوں نے یہ پیغام اسے بھیجا تھا تا کہ بات بھی پہنچ جائے اور اس کے ننان بھی پیدا نہ ہوں۔ اس پیغام کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ بیگم شیر ایساں کو بے چارہ کہنے لگی۔ اور ایلی مطمئن ہو گیا چونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے چند بار بے چارہ کہہ دیا جائے اس کے خلاف غصہ نہیں رہتا۔

چلچھاتی ہڈیاں

محمود کے جانے کے بعد ایلی کو ایک خط موصول ہوا۔ جمیل نے ایلی کو خان پو بلا یا تھا کہ کوئی ضروری معاملہ ہے۔

خان پو پہنچ کر وہ سید حاجمیل سے ملا۔

”کیوں خیر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

جمیل حسب عادت مسکرا دیا۔ گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں لفڑی نے کہا تھا بال لو۔

”کیوں؟“

”وہ آج کل پریشان ہے۔ یار کا کچھ کرو اس نے اپنی زندگی بہت تلنخ کر رکھی ہے۔ روز بیوی کو پیشتا ہے۔ روز رات کو ان کے گھر میں ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ محلے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ راہ گیر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا تو کیا اس لئے بلا بیا ہے مجھے؟“

”نہیں وہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔ جمیل نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ فقی خود بتائے گا۔ لیکن نقی کے گھر کے جھگڑے کے بارے

میں کچھ سوچ چو یار ہم سب پڑے پڑیشان ہیں۔“

شام کے وقت جب وہ نقی کے ہاں پہنچے تو وہ اردوگرد اوزار کے جوتے کا تلاسی رہا تھا۔

”ارے تم کیا کر رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جوتا سینا سیکھ رہا ہوں۔“ نقی نے جواب دیا۔

”اور وہ چیزیں کیا ہوں میں جو تم کیرپر کاڑھا لاتے تھے۔“

”ڈر گئیں۔ وہ یو لا۔“

”لیکن کوئی اور ہالی منتخب کرتے۔ ایلی نے کہا۔

”یہ ہالی تو نہیں۔“ نقی نے اپنی تھوتنی اٹھائی۔ ایک روز سوچ رہا تھا کہ آ کر ہر نیا جوتا جو میں خریدتا ہوں۔ میرے پاؤں کو کافی کیوں ہے یہ بات میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا۔ یعنی مطلب ہے کہ ذہن میں تھی یہ بات تو مجھے خیال آیا کہ یہ موچی لوگ شینڈرڈ سائز کے جوتے بناتے ہیں۔ یعنی اوسط سائز کے اور جس کے پاؤں کے اوسط سے ہٹ کر ہوں انہیں جوتے کاٹتے ہیں لہذا میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں کے مطابق جوتا سینا چاہیے یہ بات دیر سے میرے ذہن میں تھی۔ اب کی بارہہ جانے کیسے عمل میں آگئی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک ایک روز میری جیب میں بیس روپے تھے اور میں اتفاقاً اس بازار میں جائیکا جہاں موجود ہوں کے اوزار بکتے ہیں تو میں نے اوزار خرید لئے پھر جوتا سینے میں کیا دریگتی ہے۔ یہ جو ہمارے مکان سے باہر موچی بیٹھتا ہے۔ اس سے ناکالا گانا سیکھ لیا۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخڑچینی موچی کا کمال کیا ہے۔ یہی ناکہ وہ خوب صورت شکل کا جوتا نہیں بناتے بلکہ ایسا جوتا بناتے

ہیں جو پاؤں پر فٹ بیٹھے۔“

"سماں ہے تم نے بیگم کو پینے کا شغل تیز کر دیا ہے۔ ایسا نے بات بدلتی۔

”ہاں یا رفقی بولا۔“ میں نے ابھی سنا ہے۔ کل رات کو میں کو میں جو اپنی بیٹھک سے باہر نکل کر ایک بندرگاہ کان پر جا بیٹھا۔ میں نے سوچا آتے جاتے لوگوں کا تماشہ دیکھو تو وہ محلے والے آکھڑے ہوئے وہاں۔ انہوں نے یا مجھے دیکھا نہیں اور یا پچھا نا نہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ اس نقی بابو نے جو سماں تھا وہ اگر میں رہتا ہے نے بڑا اور مم مچار کھا ہے۔ محلے میں روزگاری بھی اس کی بات تو بری نہ تھی۔

نقی سے کہا ”لیکن جو جواب وہ مرے نے دیا اسے من گر کباب ہو گیا میں۔“

”وہ مرے نے کیا کہا؟“ ایں نے پوچھا۔

کہنے لگا۔ ”چھوڑو جی کس کی بات کرتے ہو۔ وہ نتی تو مستی پر آئی ہوئی کتیا ہے۔
کتیا۔ وہ نہ سا۔

”کتابھی نہیں کتیا۔ اور پھر سوچے تو بیگم سے لڑنے کو کتیا سے کیا تعلق۔ بڑی گھری بات کہدی سالے نے سمجھ میں نہیں آئی۔“

”لوپھر اسے کیوں پہنچئے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اگر اس نقطے کا مجھے علم ہوتا تو۔“

”تو کیا بے خبری میں پستھے ہو۔“

”ہاں یا راب جو تم نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ واقعی بے خبری میں یہ عمل ہوتا ہے۔
مثلا اس نے کوئی واہیات بات کی اور مجھے غصہ آیا۔ یہاں تک تو شعور ہوتا ہے۔ پھر
جو ہوش آتا ہے تو میں پیٹ رہا ہوتا ہوں اور وہ حق رہی ہوتی ہے۔“

”تو اپنے آپ کو تابو میں رکھو۔“

”یا تم سے پڑ گے لکھے ایسی بات کر تیں حیرت ہے۔ تم سمجھتے ہو جیسے میری انا

گھوڑا ہوا اور میں سوار ہوں۔ اس کے بر عکس مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری اتنا سوار ہے اور میں گھوڑا ہوں۔ میں اسے قابو میں کیسے رکھوں۔ ہاں یا رہ فرعاً اسے یاد آیا۔ جس بات کیلئے میں نے تمہیں بلا یا ہے وہ تو سنو۔ میں تو عجیب مصیبت میں بتتا ہوں۔ سمجھو لو باؤ لا ہو رہا ہوں۔ عجیب بات ہے یا تم یہ بیکم کے قصے کو کیوں لے پیٹھے یہ تو پرانا روگ ہے۔ نہ جانے میرا یا بیگم کایا دونوں کا۔ شاید اس معاملے میں میں ہی مظلوم ہوں۔ خیر خیز اس قصے کو چھوڑو۔ میں سمجھتا ہوں۔ پتھنے کے لئے اس کی ہڈیاں چلچلاتی رہتی ہیں۔“

All rights reserved. 2002
”چائے تو کہدو۔ جمیل نے کہا۔

”وہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ نقی بولا کہا تو چائے بنانے کو ہے پتہ نہیں شاید شربت بنادے یا ستو گھول دے۔ وہ ہنسنے لگا۔ پتہ ہے کل کیا ہوا۔ حقہ جو بھرا اس نے تو میں حیران یا اللہ یہ کیا بھرا ہے چلم۔ کہنے لگی تباہ کو ہے۔

”چلم اٹا کر دیکھا تو گدمی نے چائے کی پتی ڈال رکھی تھی چلم میں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”پھر لوگ کہتے ہیں۔ میں پیٹتا ہوں اسے۔“

”ہاں تو وہ بات سنارہے تھے تم۔ جمیل نے کہا۔

”یہ کیا خرافات ہیں۔ نقی نے کہا۔ بھی یہ زندگی ہے۔ شکر کرو کہ ہم تمہیں اتنی قابلیت دیتے ہیں اور جب بھی کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو تمہیں سناتے ہیں۔“

”لیکن اتنی دوسرے بلانا۔ یہ کیا زیادتی نہیں؟“

”میں نے تو نہیں بلا یا۔ نقی بولا۔ میں نے تو جمیل سے کہا تھا کہ میں جاورے ہو آؤں چونکہ میں چاہتا تھا کہ تمہارا مشورہ لوں۔ بات اسی کچھ ایسی تھی میں گھبرا گیا اور جاورے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جمیل نے کہا کہ تم وہاں نہ چلوں۔ اے یہاں بدل لو۔“

”ہاں۔ جمیل بولا۔ میں نے سوچا چلو۔ میں بھی مل جائے گا۔ اپنے بھی دو دن

خوشی سے گزرے جائیں گے۔“

تو-----یہاں

”ہاں تو بات بڑی اشیٰ سی ہے لئے نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

”پہلے میں تمہیں یہ بتا دیں تو وہ بولا۔ کہ میں یہاں چکلے میں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی مجھے وہاں جانے سے کوئی دچکپی ہے۔ سمجھ لو میرے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ چکلا کہاں واقع ہے شاید کہیں کسی جگہ اس کے جائے قوع کے متعلق سننا ہو۔ ضرور سننا ہوگا۔ لیکن مجھے شوری طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔“

”ایک روز، وہ بولا مجھے جلد کی تھی۔ ایک دنست سے ملنے کے لئے چندو محلے کی طرف جا رہا تھا۔ کابلی دروازے پہنچا تو میں نے چکلے کی گلی کی طرف دیکھ کر سوچا کہ رادھا چوک سے گھوم کر کیوں جاؤں۔ اسی گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں ضرور یہ گلی آگے کہیں نہ کہیں نکل جائے گی۔ بندگلی تو معلوم نہیں پڑتی۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں چکلے کی گلی میں داخل ہوا۔ اب اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہوں کچھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا۔ میں نے سراٹھا کر دیکھا ہی نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں تھی۔ بھیڑ تو رات کی وقت ہوتی ہے۔ آڈھی گلی تو میں نے ایسے ہی ان جانے میں عبور کر لی۔ اب جو سراٹھ کر دیکھتا ہوں تو سامنے ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ میں گھبرا یا۔ اوہر دیکھتا ہوں کہ ایک دروازے میں کھڑکی ہے۔ ایک اوہر چوکی پر بیٹھی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں چکلے سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت مکدر تو ہوئی لیکن میں نے سوچا اب آ جو گیا ہوں تو نکل ہی جاؤں۔

”ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ چو بارے کے جنگلے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں خواہ مخواہ رک گیا۔ عجیب انداز سے بیٹھی تھی۔ نہ تو

وہ راگھیروں کو دیکھ رہی تھی اور ناپنا آپ دکھار رہی تھی۔ نقی مسکرا یا۔ ”اسے خبر رہی نہ تھی کہ وہ بیٹھی ہے یا کھڑی ہے یا کہاں بیٹھی ہے۔ باور پچھا خانے میں بیٹھی ہے یا پلیٹ فارم پر یا چکلے میں۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنایا کراس میں ٹھوڑی رکھی ہوئی تھی اور خود کھوئی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے روئی روئی ہو۔ بال کھلے تھے پر بیشان حال کپڑے پر پرواہی سے پہنے ہوئی۔ بس صرف ہوتھوں پر لپٹک گئی تھی اللہ اللہ خیر ملا۔

”اسے دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آیا کہ یہ کہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چند ایک ساعت تو میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا چلو چھوڑو مجھے کیا لینا دینا ہے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے اپنا کیا لیتی ہے میں چل بیٹاں یا سواں میرے دل میں کامیاباً رہا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ دو قدم چلا پھر رک گیا۔ مجھے غصہ محسوس ہونے لگا۔ آخر یہ کیوں یہاں بیٹھی ہے۔ پھر رک گیا۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ لیکن غصہ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔ جی میں آیا کہ جا کر پوچھوں تو اس میں حرج کیا ہے۔

”میں واپس آیا۔ لیکن جب اس کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو خیال آیا کہ آخر اور پر جا کر کہوں گا کیا۔ لاحول ولا قوہ۔ کیا فضول خیال ہے۔ اگر میں نے کہہ دیا کہ بیٹھی ہوں تجھے کیا تو کیا جواب دوں گا۔ اس خیال پر میں آگے چل پڑا۔ لیکن آگے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر قدم کے بعد رک جاتا۔ غصہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہر صورت اتنی بار رہا۔ میں کہ میں نے سوچا آگے جانا بے کار ہے اور پھر اس قدر غصے میں آچکا تھا کہ کوئی اور بات ذہن میں نہ رہی تھی۔ لہذا میں نے ایک تانگا لیا اور تانگے والے سے کہا کہ مجھے گھر لے چل۔ گھر پہنچ تو گیا لیکن وہاں بھی رہ رہ کر مجھے یہ خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے اور وہ غصہ جو مجھے آ رہا تھا۔ وہ میں نے سب بیوی پر لکالا۔ پہیٹ پہیٹ کراس کا پلستر لکال دیا۔ میرے اپنے ہاتھ دکھنے

لگے۔ پھر تھک ہار کر سو گیا۔

”اگلے روز پھر وہی چکر۔ دفتر گیا تو وہاں کام کرتے کرتے رک جاتا اور وہی خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ بہار سمجھایا لیکن بے کار۔ اب میں دفتر میں خواہ مخواہ لوگوں سے الجھ رہا ہوں بے کار باتوں پر لڑ رہا ہوں حتیٰ کہ صاحب سے جا کر الجھ پڑا۔

”پھر میں نے سوچا یہ تو بڑی بات ہے کھر چلو ورنہ گڑ بڑ بیٹھوں گا۔ تو میں طبیعت خراب ہو نیکا بہانہ بنائے کھر چلا آیا۔ راستے میں اپنی حماقت پر سوچتا آیا۔ چلتا رہا اور سوچتا رہا چلتا رہا اور سوچتا رہا۔

”اب جو آنکھا تھا کہ وہ نیتا ہوں تو اس کے چوبارے کے نیچے کھڑا ہوں۔ یعنی گھر کو پیچھے چھوڑ کر ایک میل آگے نگل کیا اور مجھے علم ہی نہ ہوا کہ آگے نگل آیا ہوں یا کہاں جا رہا ہوں۔

”یا راستہ غیر مانوس ہے۔“

چوبارے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میرا مطلب ہے ہنگے میں کوئی نہ تھا۔ اس وقت کون ہوتا بھلا دو پھر کو دو بجے کون طائفہ باہر بیٹھی ہے۔

”وہاں جو ہوش آیا تو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ یہ میں کہاں آگیا ہوں اور اس قدر شدت سے غصہ آیا اپنے آپ پر کہ اب اپنے دل کی بات ماننے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لہذا اب مجھے اور پڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ اور پھر بارے میں دو میلے کچلے کپڑوں میں چار پائی پر بیٹھی تھی۔ میں نے اور جاتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہی بات ہوئی تھی بولا۔ نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ جی سلام۔ میں نے کہا تو یہاں کیوں بیٹھی ہے اور تیرا یہاں بیٹھنے سے کیا مقصد ہے اور تو کیا طائفہ ہے پھر تیرا یہاں کیا کام؟

”پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔ سمجھتی ہو گی کوئی پا گل

ہے۔ پھر اس کے حواری آگئے۔ انہوں نے آکر مجھ سے الجھنا شروع کر دیا اور غصے سے میرا دماغ اور بھی چل گیا اور میں نے اتنا اودھم چیزیا اور ان سے اتنی مارکھائی کہ کیا بتاؤں۔ پھر لوگوں نے مجھے چھڑایا اور تانگے میں ڈال کر گھر بھجوایا۔

”اگے روز پھر وہی جنون نہ میری زندگی کو یا حرام ہو گئی۔ بس یہی دھن جی میں سماں تھی کہ وہاں جاؤں اور جا کر اس سے لڑوں۔ چار ایک روز میں نے زبردستی اپنے آپ کو روم کے رکھا پھر مجھے خیال آیا۔ کہ یہ بھوت ایسے نہیں اترے گا۔ سمجھانا بجھانا فضول ہے۔ لہذا میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جاؤں اسے بک کروں۔ منہ مانگ دام دوں اور پھر لرنے کی بجائی اس سے باقی میں کروں شاید اس اقدام سے دل کی بھروسی انکل جائے تو صاحبِ نقی نے قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ اس روز میں نے نہاد ہو کر لباس پہننا اور بنستہ نور کر رات کو وہاں چاہنچا۔

”اس کے حواریوں نے جب دیکھا کہ میں رات رہنا چاہتا ہوں اور میرا دنگا فساد کا ارادہ نہیں تو انہوں نے مراحت نہ کی۔ البتہ حرامیوں نے مجھ سے بہت سے پیسے مانگے۔ ظاہر تھا کہ مجھے ٹھنگ رہے ہیں۔ خیر میں نے کہا جو مانگو گے ووں گا۔

”تو جناب، نقی بولا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ میں اس کے ہاں ٹھہر نے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یعنی میں صرف باقیں کرنا چاہتا تھا اور بس ٹھہرنا محض بہانہ تھا۔ خیر۔

نقی اور بانو

”جب ہم اکیلے رہ گئے تو عجیب بات ہوئی۔ اب میں چپ چاپ کر سی پر بیٹھا سکریٹ پی رہا ہوں اور دو کن انگھیوں سے میری جانب دیکھو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آخر میں بات شروع کی میں نے کہا۔ بتانا مجھ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔“

وہ بولی۔ تو اس بات کو چھوڑو۔ تجھے اس کام سے واسطہ۔ میں نے کہا۔ میں تو آیا ہی اس لئے ہوں کہ تجھ سے پوچھوں کہ آخر بات کیا ہے؟ تو یہاں کی نہیں۔ نہ تو

یہاں کی دھنیتی ہے۔ نہ تیری کوئی حرکت ایسی ہے۔ جو ظاہر کرے کہ تو یہاں کی ہے بلکہ تجھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے جیسے کوئی پھلی ریت پر پڑی ہے۔ تو تو یہاں دم توڑ رہی ہے۔

”پھر میں نے اس سے محبت بھرے انداز سے بات کرنی شروع کی کیونکہ ویسے تو وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ دیکھ بانو، چونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا نام بانو ہے۔ یہاں اس بازار میں وہ بیٹھی ہیں جو جسم ہی جسم ہوں اور تو تو جسم ہے ہی نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تو بغیر جسم کے ہوں۔ یہ روئی روئی آنکھیں یہ کھوئی کھوئی نکاہ۔ جیسے کوئی راستہ بھول گیا ہو اور رور تھک گیا ہو۔

”وہ مجھ سے بار بار کہتی رہی تو چھوڑ اس قصہ کو لیکن میں نے اپنی رث نہ چھوڑی پھر وہ پوچھنے لگی۔ تو کون ہے۔ میں نے اسے اپنا نام اور کام بتایا۔ اپنا گھر کا پتہ دیا۔ پھر وہ پوچھنے لگی۔

”تو مجھے حق میں لے گا۔“ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔

”میں نے کہا۔ تو غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے تیری ہوں نہیں۔ مجھے عورتوں سے کچھ دل چسپی نہیں اور نہ ہی میں تیری محبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تو یہاں کیسے آ گئی۔ یہ تیری جگہ نہیں۔

”قصہ کوتاہ۔ نقی بولا۔ پھر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ کہنے لگی میرے نصیب۔ پھر میں نے بحث چھیڑ لی اور پھر مجھے غصہ آئے لگا اور جب اس نے دونوں بانہیں میری گردن میں ڈال کر ہونٹ میری طرف بڑھائے اور بولی۔ اب چھوڑ بھی نا تو غصے میں میں نے اسے یہ تھپٹ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور اس نے شور مچا دیا اور پیشتر اس کے کہ حواری آپنے میں بھاگ آیا اسے ملے مجھے دس دن ہو چکے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ چاہے میں یورپ کو جاؤں یا پہنچتم کو مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اس کے چوبارے تلے جا پہنچتا ہوں

اور ہوش آتا تو وہاں سے بھاگتا ہوں۔ سارے چکلے میں چرچا ہورہا ہے۔ لوگ گردن اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے ہیں۔ طالقوں کے بھڑوے مجھے دیکھ کر رہتے ہیں۔ رندیاں میرانداق اڑاتی ہیں۔ اور وہ بانو۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ساگت ہو جاتی ہے۔ جیسے پھر ہو گئی ہو۔ اس نے نہنا مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتی عجائب تماشہ ہے۔ وہ ہنسنے لگا۔

پھر دفتار اسے خیال آیا یا وہ چائے تو مدت سے بنی ہوئی ہو گی میں لایا ہی نہیں۔ ”وہ اندر پلاں لیا اور چھتر ساعت کے بعد چائے کا ٹریے اٹھائے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے چائے بنانا شروع کیا۔

”ہاں۔“ وہ چائے بناتا ہوا بولا۔ تو تمہاری نفیات کیا کہتی ہے۔ الیاس آصفی یہ سب گڑ بڑ گوناکہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے مجھ سے۔ یارا یہی عجیب و غریب باتیں کیوں ہوتی ہیں۔

کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر بات اسی ہر واقعہ پیچیدہ اب بتاؤ میں کیا کروں۔“

”اے۔“ وہ چائے کی طرف دیکھ کر چلا یا۔ یہ کیا چیز ہے۔“

چائے کا رنگ ہلاکا پیازی تھا۔ جیسے چائے نہیں بلکہ پشاوری قہوہ ہو۔

”لو۔“ وہ بولا۔“ پھر اس نے گڑ بڑ کر دی۔ نہ جانے قہوہ بنادیا ہے کہ کیا حد ہو گئی۔ اُنکی نے چائے وانی اٹھا لی اور اندر چلا گیا۔

پہلے تو مکان سے اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دفتار چیخ و پکار شروع ہو گیل وہ دھاڑ رہا تھا اور نہ جانے کس چیز سے بیگم کو زد و کوب کر رہا تھا اور وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

”اور ارے اور پیٹ اور پیٹ۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں تیری ہڈیاں توڑوں گا۔“

”تو توڑے۔ ایک بار میں قصہ ختم کر دے۔“

”وہ قصہ ختم کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔“

پڑوںی چاروں طرف اکٹھے ہو گئے۔

”اب چھوڑ جسی کہہ مار کر ہی دم لے گا۔“ ایک نے کہا۔

”اے کیا قیامت اٹھا رکھی ہے تم نے۔“ وہ سر بولا۔

”اے نقی صاحب اے نقی صاحب۔“

وہ ایک محلے والے بیٹھک میں آ گئے۔ گیوال صاحب یہ کیا آئے دن کا فساد

سے ہمارے ناک میں دم آ گیا بھائی صاحب۔“

ایلی اور جمیل خاموش بیٹھے تھے۔

اندر جھگڑا بڑھتا جا رہا تھا۔

اس پر محلے والے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے نقی کو پکڑ لیا لیکن وہ ویسے

ہی چیخنے جا رہا تھا۔ اندھیر خدا کا حقے میں تو چائے ڈالتی ہے اور چائے بناتی ہو تو پان

کا زردہ ڈال دیتی ہے۔ وہ چیخ رہا تھا۔

”چلو چلیں۔“ جمیل نے ایلی سے کہا۔

”لیکن یہ گڑ بڑ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ تو یوں ہی رہے گی۔ جمیل بولا۔“ کوئی مد نہیں کر سکتا کوئی دخل نہیں دے

سکتا۔“

”لیکن۔“ ایلی بولا۔

”بے کار ہے نقی کا بھید کسی نے نہیں پایا۔“

”کیا واقعی۔“

وہ دونوں بیٹھک سے باہر نکل آئے۔“

باہر بازار میں چراغ جل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا آسمان پر گلابی
بادل تیر رہے تھے۔

بیٹھ کے پاس ہی ایک عورت کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

وہ ان کے قریب آئی۔ ”یہ نیا محلہ ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“ جمیل نے جواب دیا۔

”مجھے اُنی صاحب کے گھر جانا ہے۔ وہ بولی۔ مکان نمبر ۳۰۲ آپ کو معلوم ہو
گیا؟“

”نقی صاحب کے ہاں۔“ جمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی۔ وہ دبلے پتلے صاحب ہیں۔ فونگر کتب اپاراؤٹ میں ملازم ہیں۔“

”آپ کون ہیں؟“ جمیل نے پوچھا۔

”میں _____ وہ رک گئی۔“

”اُن کی رشته دار ہیں کیا؟“ جمیل نے پوچھا۔

”خوبیں۔“ وہ بولی میں اُن کی جان پہچان ہوں۔ مجھے ان سے ضروری ملتا ہے۔“

”آپ کا نام بانو ہے نا۔ ایلی نے کہا۔“

حیرت سے اس کامنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بانو _____“ جمیل نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔

”جی بان،“ وہ بولج۔

”اُرے تم کہاں جا رہے ہو۔“ نقی نے بیٹھ کے سر نکال کر انہیں آواز دی۔“

یہ بیجھے نقی آ گیا۔ ایلی نے کہا۔

بانو کو یوں اپنے گھر کے دروازے پر دیکھنے کیلئے آنکھیں اب ل آئیں ایک ساعت
کیلئے وہ جھجکا پھر وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ بانو سمٹ کر رک گئی، خوف سے اُنکی

آنکھیں پتھرا گئیں۔ لیکن جسم کے بند بند میں سپردگی موجودیں ماری رہی تھیں۔ باہر بازار میں چڑاغ جھلما رہے تھے۔ گلابی بادل دھنڈ لارہے تھے۔ ہوا رک کر سر گوشیاں کر رہی تھیں۔ نقی بانو کی طرف یوں بڑھ رہا تھا۔ جیسے وہ ایک خوفناک موج ہو۔ بانو ڈوب جانے کی منتظر تھی۔ ”چلو،“ جمیل نے ایلی کو کہنی ماری اور وہ چپ چاپ چل پڑے۔

انکوائری

جب ایلی واپس جاؤ را پہنچا تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ اس کے تمام ساتھی گھر پر جمع تھے۔

”ارے۔ افضل چلا یا۔“ ایلی آگیا۔ ”ایلی آگیا۔“
ایلی آگیا ایلی آگیا، چاروں طرف شور مچ گیا۔

”بڑے موقع پر آئے ہو ورنہ تمہیں تار دینے والے تھے۔ چودھری بولا۔“
”آخر بات کیا ہے۔ ایلی نے پوچھا۔

”پناہ چل گیا۔ افضل نے شور مچایا۔“

”اور شیخ کی بات بتاؤنا۔ اسہال جاری ہیں بری حالت ہے۔ شبیر نے کہا۔“
”صاف بات کرو یا اسے پریشان کیوں کرو رہے ہو۔ افضل بولا۔“

”جو پو دا بولیا تھا۔ اسے سمجھ لو چل لگا ہے۔“

”یا رانکوائری ہو رہی ہے۔“

انکوائری کی خبر سن کر ایلی ساکت رہ گیا۔

”ہاں ہاں۔“ شبیر بولا۔ خود مسلم معروف انکوائری کیلئے آ رہے ہیں۔“

”خود؟“

”ہاں ہاں۔“

”کب؟“

”کل صحیح۔“

اگلے روز سکول پر سنا ناچھایا ہوا تھا۔ مسٹر معروف شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ باہر اس اساتذہ کے دل وہڑک رہے تھے اور وہ انتقام اڑکوں کو گھور گھور کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ سازشیوں کے رنگ زرد ہورہے تھے۔ ان کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ لیکن ہونٹ بھپٹے ہوئے تھے۔ چپر اسی مودبانہ سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ڈرل مارٹر خصوصی طور پر کمرج میں احکامات نافذ کر رہا تھا اور ایلی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ سے باوباد افضل کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے ایلی سے کہا تھا۔ تمہارے ساتھیوں میں جرات نہیں نہ یہ بات لے سکیں گے نہ سامنے آ سکیں گے۔ اب سوچ لو۔ آیا سامنے آتا ہے یا نہیں۔ دلوں پہلوں میں۔ اگر تم سامنے نہ آئے تو ممکن ہے سارا کیا کرایا بے کار جائے اور ار رہا منے آ گئے تو شاید زور میں آ جاؤ فنا کہہ کچھ بھی نہ ہو۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

طبعی طور پر وہ سامنے آ جانے کا قائل تھا۔ وہ صرف اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ میرے سامنے آ جانے سے باقی ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔

سکول کے بچے کو چھٹی دینے کے بعد مسٹر معروف نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ ہال کمرے میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف شیخ صاحب سے بتائیں کر رہے تھے۔ اساتذہ بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر معروف کا شیخ سے بر تا و ایسا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شیخ مسعود کی ہر بات کی اہمیت دیتے ہیں۔ انکے ہر مشورے پر عمل کرنے کے لیے بہت اب ہیں۔ باتوں کے دوران میں وہ پنجی نگاہ سے اساتذہ کے رد عمل کا جائزہ لے رہے تھے یا شاید یہ دیکھ رہے تھے۔ کہ جواہر وہ پیدا کرنا چاہئے تھے کیا وہ پیدا ہو رہا ہے۔

شیخ صاحب نہایت مودبانہ بیٹھے تھے۔ لیکن انکے چہرے سے فکر کے آثار متربع تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے جھجک اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

دفن ام معروف صاحب نے اس ائمہ کو خطاب کرنا شروع کیا۔

”اس ائمہ کرام وہ بولے میں آپ کے سکول میں انکوائری کے لئے آیا ہوں۔“

“

”کوائف یہ ہیں کہ قریباً ایک سال سے جاوراء سے گم نام شکایتی خط موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کا اندازہ انوکھا ہے۔ روز ایک خط بھیجا جاتا ہے۔ جس میں صرف ایک شکایت درج ہوتی ہے، وہ بھی نہایت اختصار سے گم نام خط لکھنے والا یقیناً کوئی ذین ادمی ہے اور یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ یہ شکایت کسی خاص ادمی کے خلاف نہیں ہوتی۔ بہر حال ظاہر ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک یا چند لوگ مل کر یہ خطوط بھیج رہے ہیں۔ میں صرف آج اس لئے آیا ہوں کہ اس کے متعلق انکوائری کروں۔ لیکن انکوائری جبکی ہو سکتی ہے۔ جب مدعا اور مدعاالیہ دونوں موجود ہوں۔ مدعا شکایت پیش کرے۔ مدعاالیہ اس کا جواب دے اور میں انسپکٹر کی حیثیت سے دونوں پارٹیوں کے دلائل سن کر اس کا فیصلہ کروں۔ لہذا میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست کروں گا کہ جو بھی مدعا ہے وہ اپنا آپ ظاہر کرے۔“

مسٹر معروف خاموش ہو گئے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تمام اس ائمہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

مسٹر معروف نے چند ایک منٹ انتظار کیا۔ وہ اس ائمہ کو جانچتے رہے لیکن پھر مزید وضاحت کے لئے کہنے لگے۔

”دیکھئے،“ وہ بولے۔ یہ بات تو میں تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں کہ شاف کے علاوہ کوئی اور شخص ایک سال سے اس سکول کی شکایت بھیج رہا ہے۔ کے درست نہیں۔“ انہوں نے اپوچھا۔ اس ائمہ خاموش بیٹھے رہے۔

مدعا اور مدعاالیہ

”تو آپ کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ آپ کوہیرے خیال سے اتفاق ہے۔ مسٹر

معروف مسکر کر کہنے لگے۔ لہذا اگر آپ میں ہی وہ صاحب موجود ہیں۔ جو ایسے خط
لکھ رہے ہیں۔ تو وہ مجھ سے بات کریں اور اگر آپ میں سے کوئی شخص ان خطوط کو
اپنائے کے لئے تیار نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ انکو اُری ختم ہو گئی۔ کیونکہ آگر آپ میں
سے کسی شخص کو کوئی شکایت ہی نہیں تو انکو اُری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

ایلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شیخ کا چہرا بھیا سکھ ہو گیا۔ لیکن مسٹر معروف
نے اسے چند اس اہمیت نہ دی۔

”آپ کیا کہنا چاہئے ہیں الیاس صاحب۔“ معروف بنتے پوچھا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ کیا گم نام خط لکھنے والے نے
انکو اُری کا مطالبہ کیا ہے۔“
مسٹر معروف کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔ میرے خیال میں نہیں۔ تو
آپ خود ہی انکو اُری کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہذا مدعا کے ہونے نہ ہونے
سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ایلی نے کہا۔

”ہوں۔“ مسٹر معروف مسکرائے۔ ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ انکو اُری ہو۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

مسٹر معروف نے تمام اسامتہ کو مخاطب کر کے کہا کیا آپ میں سے کوئی
صاحب چاہتے ہیں کہ انکو اُری ہو۔“
سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔

”میری ایک گزارش اور ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کہو۔“ معروف بولے۔

”ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ شکایات کسی فرد کے خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ
مدعا یہ بھی کوئی نہیں ہے تو پھر مدعا کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ کچھ دیر
تک مسٹر معروف خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ ”الیاس صاحب معلوم ہوتا ہے۔

کہ آپ کو اس کیس سے خاصی دلچسپی ہے۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

”کیا دلچسپی ہے؟ معروف بولے۔

”مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہواں کو آگ دی گئی ہو۔

مسٹر معروف نے تیرتھ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

اساتذہ کرام نے گرد نمیں انہائیں۔ بال کمرے میں سرگوشیاں گو نہیں لگیں۔ چودھریک کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرنا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائیورگ ماشر مسکرا رہے تھے۔

”تو آپ مدعا ہیں۔“ مسٹر معروف بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔“

”ویکھئے الیاس صاحب۔“ مسٹر معروف نے پینتر بولا۔ میں یہاں الصاف کرنے نہیں آیا۔

میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق نظم و نسق نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسا فعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ آپ کے نظم و نسق کی تو ہیں ہو رہی ہے آپ ہی مدعا ہیں آپ ہی مدعا لیے ہیں۔“

”تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔“

”شکایت کیا تھوڑے متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے۔“

مسٹر معروف بولے۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں۔ ”مسٹر معروف بولے۔

”تونہ دیکھئے آپ جانیں آپ کاظم و نق جانے۔“

مسٹر معروف نے ایک قہقہہ مارا۔ آپ بڑی ولچپ پالائیں کرتے ہیں۔ مسٹر آصفی۔ میں آپ کی ذہانت کی وادو بتا ہوں۔ لیکن اس پرست سے آپ نوکری نہیں کر سکیں گے۔“

انکوائری کے بعد فضائی پروایا کیک ادا کی اور وہی انی چھائی وہ ادا سی جو کامیابی اور جدوجہد کے بعد چھا جاتی ہے۔ کیا یہی وہ انکوائری جس کے لئے انہوں نے زندگی کا ایک سال حرام کر دیا تھا۔ ایک سال محنت کی تھی۔ سوچ بچار کی تھی۔ پلان بنائے تھے آخراں تمام تگ و دو کا مقصد کیا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

مولوی! مولوی! منڈیر پر بیٹھا ہوا کوچلا یا۔ مولوی! مولوی!!

اس کے روپ و پاگل مولوی آ کھڑا ہوا۔ وہ مرک پر بنی ہوئی مسجد پر کھڑا تھا۔ سن رہے ہیں آپ۔ ایلی چلایا۔ سن رہے ہیں آپ۔ آپ کو ستانے والا آج خود مصیبت میں گرفتار ہے۔ ”ہوں ہوں۔“ مولوی نے مرکرا میلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خالی تھا۔ خوشی اور غم سے بے نیاز۔ ”ہوں ہوں۔“ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا ”بے کار ہے بے کار۔“ ایلی کے دل سے آوازیں آنے لگیں۔ تم ایک دلکشی کا دلکش درد نہیں کر سکے۔ تم اسے صرف نہ دے سکے۔ الثاتم نے ایک اور آدمی کو دلکشی بنادیا۔

ایلی کے روپ و شیخ آ کھڑا ہوا۔ وہ کھسپانی ہنسی نہس رہا تھا۔ میں صرف اس لئے پڑ گیا۔“

وہ بولا۔ کہ تم نے دوست میں کر مجھ پر وار کیا۔“

اپنے مدرسہ معروف مسکرا رہے تھے۔ الیاس زندگی سے انصاف کو توقع رکھو گے تو سداد دکھلی رہو گے۔ سرکاری ملازمت میں انصاف نہیں ہوتا صرف ایڈمنیسٹریشن ہوتی ہے اور ایڈمنیسٹریشن کے پیش تک ظالم مظلوم دونوں پتے ہیں۔“

ایلی کے ساتھی خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہار مویم ایک طرف پڑا تھا۔ تاش کے پتے صحن میں اڑ رہے تھے۔

”کچھ من انہیں آیا ایلی۔ افضل کہہ رہا تھا۔

”ہاں یا رکچھ بھی تو انہیں ہوا۔ شبیر آہیں بھر ج رہا تھا۔

احمد سر جھکائے بیٹھا گئی۔ سوق میں پڑا تھا۔

ڈرینینگ ماسٹر کہہ رہا تھا۔ اب اس انکوارٹری کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“

پوم پوم

میں اس وقت باہر سے پوم پوم کی آواز آئی اور پھر محمود نہستا ہوا اندر آگیا۔

”چلو۔“ ”وہ بولا۔ جلدی کرو۔ جلدی۔ ابھی واپس آ جانا۔“

”کہاں جانا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کار۔“ ایلی نے دہرایا۔

”ہاں ہاں۔“ محمود بولا۔ تم سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”اچھا۔“ ایلی بولا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

دروازے کے باہر میدان میں کار کھڑی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ محمود بولا۔ بھئی بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بڑی ضروری باتیں

ہیں۔“

محمود نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا اور جو نہیں وہ کار میں داخل ہوئے گاڑی چل

پڑی۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر ایلی چلایا۔ ”ارے یہ تو میم ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ محمود نہ سا۔“ تمہیں کیا کہتی ہے اس نے زہرب کہا۔

”لیکن تم تو کہتے تھے باقیں گرینگے۔“

”باقیں ہی تو کریں گے۔“

”باقیں کرنا جنم تو نہیں۔“

”لیکن یاد رہے۔“ ایلی بولا۔

”میڈم یہ میرا دوست کہہ رہا ہے۔ محمود نہ میم کو خطاب گر کے کہا۔ کہ آپ کی موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔“

”وہ مز کر دیکھے بغیر پنجابی میں کہنے۔“ بام پنجابی نہیں سمجھتا۔

”معاف سمجھے۔“ محمود بولا۔ تمیں شک ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔“

”شکی مجاہ اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ پنجابی میں بولی۔

”لیکن آپ تو پنجابی بول رہی ہیں۔ ایلی نے کہا۔

”خالی بولنا ہے سمجھنا نہیں۔ وہ بولی۔“

ایلی قہقہہ مار کر نہ سا۔ اس نے محسوس کیا کہ کار میں تمیں بچے بیٹھے تھے۔ میم ویم کوئی نہ تھی۔ اس لیے وہ چلا چلا کر باقیں کرنیلا کا۔

”میرا تار ملا تھا۔“ محمود نے پوچھا۔

”کیسا تار؟“ ایلی نے کہا۔

”جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ میں آرہا ہوں تیار رہنا۔ محمود نہ کہا۔

”نہیں تو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آرہا ہوں۔“

”نہیں تو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔“
”نہیں تو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تعجب کی بات ہے۔“ اس نے کہا اور پھر وہ ادھرا دھری کی باتوں میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ ایلی کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ موڑ کوئی اور بھی موجود ہے یا موڑ مسلسل چلے جا رہی ہے۔

دو کانوں کو دیکھ رک دفندا ایلی کو خیال آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔
ذرارو کے میں سریت خریداں۔“

کار سے باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا۔ اسے کوئی وہ چلا یا۔ یہ کوئی جگہ ہے۔
 غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ کار جاورا کے چکر کاٹ رہی ہے۔
”کوئی جگہ ہے۔“ محمود نے نہ کر پوچھا۔

”یہ تو لاہور معلوم ہوتا ہے۔“

”اوہ کیا پشاور ہو۔“ محمود نے کہا۔

”کیوں پرشیان کر رہے ہو اپنے دوست کو۔“ مسٹر فلپ نے کہا۔
”یہ جاورا کا بازار ہے۔“

لیکن میں واپس کیسے جاؤں گا۔ ایلی نے پوچھا۔

”رات کی گاڑی سے چلے جانا۔ صح پہنچ جاؤ گے۔“ محمود نے کہا۔

”یا بیماری کی عرضی دے دینا۔ مسٹر فلپ نے کہا۔ آخر میڈیا یکل سٹریٹکیٹ کس مرض کی دوا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یہ بھیک ہے۔“ محمود چلا یا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔“

”کہاں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نیا شہر۔“ محمود نے جواب دیا۔

”لیکن تم تو لاکل پور ہونا۔ ایلی نے پوچھا۔

”اوہ ہوں۔“ محمود بولا۔ فتر تبدیل ہو کر نیا شہر میں چلا گیا ہے۔“

”اب غصہ میں آنے کا کیا فائدہ۔“ مسز فلپ نے کہا۔

”محترمہ۔“ وہ بولا۔ اس شخص نے مجھے دھوکا کیا ہے۔“

”کوئی نئی بات ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو چھوڑو۔“ وہ بولی۔

اور موڑ پھر چلان پڑی۔ رات لا ہو رکھنے کے بعد اگئے روز وہ تینوں نیا شہر جا

پہنچ۔

مسز فلپ

مسز فلپ اور یہ عمر کی عورت تھی۔ لیکن وہ یوں چلتی پھرتی تھی۔ جیسے ابھی ابھی جوان ہوئی ہوا اور اسے انوکھی زندگی سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ والہانہ عشق تھا۔ وہ مسرت بھری حیرت سے ہر چیز کی طرف دیکھتی جیسے اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہو۔ بچوں کی طرح تالیاں بجا تی اور پھر چاہتی کہ کسی اور کو دکھائے۔ اس تازہ مسرت میں کسی اور کو اپنا شریک بنائے۔ اس کے لئے زندگی سکون اور اطمینان نہیں بلکہ مسلسل حرکت مسلسل مسرت اور مسلسل ٹگ و دو تھی۔ غالباً اسی وجہ سے وہ زندگی کی خوشیوں میں پندرہ افراد کو شریک کر چکی تھی اور اب مسز فلپ اس اس کا سوال ہوا۔ خاوند تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر ذہانت اور چمک کی مالک تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس کے ہمراہ چلتے تو تھے لیکن بہت جلد تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ اکیلی ہے تنہا ہے۔ اس بات پر اسے غصہ آنے لگتا۔ اس وقت اس کی خواہش ہوتی کہ کوئی اس سے محبت کرے یا اڑے، بحث کرے ہاتھ پالی سے بھی گریز نہ کرے۔ اسے جمود سے نفرت تھی۔ سکون ایک

بھیا نکل چیز دکھائی دیتی تھی۔ اے ہربات گوارا تھی۔ سکون سے نکال کر پھرے متحرک کردے چاہے وہ حرکت کس قدر شدید اور خطرناک کیوں نہ ہو بلکہ ہوتا اور بھی اچھا۔ ممزٹلپ کے لئے واحد خطرہ سکون تھا۔

اس کا نیا خاوند ممزٹلپ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن خوبصورت کے علاوہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔ جو مسٹر مزلپ کی شخصیت کو جذب کر سکتی۔ درحقیقت ممزٹلپ سے شادی کرنے سے مسٹر مزلپ کا مقصد ہی کچھ اور رہتا۔
مسٹر مزلپ ایک نیکری میں ملازم تھا اور اسکی ملازمت اس نویت کی تھی کہ تنواہ میں گزارہ مکان نہ تھا۔ وہ نمیشہ حاجت مندرجہ تھا۔ لیہ حاجت مندرجہ ممزٹلپ کی اپنے خاوند سے دل چھی میں کویا سونے پہنچائے کا کام دیتی تھی۔ پھر ممزٹلپ کے خطوں کا ایک تاتا بندھ جاتا۔ فلپ ڈارٹ لگ تھیں مزید روپے کی ضرورت تو مجھے فورا اطلاع دو۔ نہیں ڈارٹ لگ گھیا سگریٹ نہ پینا۔ اگر بورے وال میں اعلیٰ سگریٹ دستیاب نہ ہوتے ہوں تو مجھے لکھوتا کہ میں نیا شہر سے بھینٹھیج دوں۔

ممزٹلپ میں مامتا کا ایک طوفان وبا پڑا تھا۔ چونکہ سولہ شادیوں کے باوجود واس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور وہ مسٹر مزلپ کا یوں خیال رکھتی تھی۔ جیسے اس کا اکلوتا پیٹا ہو۔ ممزٹلپ اس کی اس کمزوری سے واقف تھا اور دل کھول کر اس کے مامتا بھرے جذبات کو حرکت میں لانے اور ان میں شدت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کیا کرتا تھا۔ وقت یہ بھی تھی وہ بہت دور دراز مقام پر نوکری کرتا تھا اور ممزٹلپ کو خالی خطوط پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ شاید اسے خاوند کی جسمانی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو مگر مسلسل تہائی اسے کھانے جاری تھی۔

جب کبھی ممزٹلپ کو اپنی تہائی کا شدت سے احساس ہوتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس وقت اس کا بھی چاہتا کہ کوئی ایسا ساتھی ہو جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکے۔ یہ کیا زندگی ہوئی کہ لڑنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ پیار کرنے والا نہیں نہ سہی۔ لڑنے والا بھی ہو